سلطان شہاب الدین غوری



سلطان شہاب الدین غوری۔اور سلطنت غزنی

سلطان شہاب الدین غوری اگر چہ سلطان محمود غزنوی کے نام و مقام تک نہ پہنچ سکے مگر ہم اسے سلطان محمود غزنوی کا ایک سچا منگر ضرور کہتے ہیں کیونکہ سلطان شہاب الدین غوری نے ''فتح ہند'' کے محمود منصوبے کو اس کی تکمیل کے قریب ضرور پہنچادیا اور خاص بھارت میں ایک اسلامی حکومت کی بنیاد رکھ دی۔

غزنی کے شمال و مشرق میں کوہ سفید کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔بارہویں صدی عیسوی میں اس کے پہاڑی قلعوں میں ترک اتا جیک نسل کے قبیلے آباد تھے۔ جب غزنوی سلطنت کمزور ہوئی تو ان سے ایک ''غوری'' قبیلہ نے قوت حاصل کر لی اور تھوڑی ہی مدت کے بعد یعنی 1160ء میں حکومت غور پر غیاث الدین کا انتخاب ہوا۔اس کا چوتھا بھائی شہاب الدین تھا جس نے معز الدین محمد بن سام کے لقب سے پہلے مغربی ہندوستان پر حملہ کیا اور پھر شمالی ہند پر فوج کشی کی۔اس کی حکومت کا آغاز کے صوبے میں 1172ء سے کیا جاتا ہے۔اگر چہ بڑے بھائی کی زندگی میں اس نے کبھی خودمختاری کا عویٰ نہیں کیا۔

شمالی ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے عہد سے باقاعدہ طور پر حملے شروع ہو چکے تھے ۔غزنی کو عام بدامنی سے محفوظ رکھنے کے لئے شہاب الدین نے پہلے بلوچستان اور سندھ کے علاقوں پر قبضہ کیا پھر بھائی کی فرمائش پر ملتان کو باطنی شورش سے نجات دلائی ۔اچ میں بھاٹیہ راجہ آزاد ہو گیا تھا۔اس کو شکست دی۔پھر گجرات پر حملہ کیا اگر چہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا مگر یہ فائدہ ضرور ہوا کہ شہاب

الدین غوری کی توجہ پنجاب کی طرف مبذول ہوگئی اور کچھ ہی دنوں بعد یہ صوبہ معہ اپنے پائیہ تخت کے سلطان شہاب الدین غوری کے قبضہ میں آ گیا۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم برصغیر میں ''غوری'' خاندان کے حالات اور واقعات کی طرف آتے ہیں۔ کیونکہ برصغیر پاک ہندو میں اسلامی سلطنت کا آغاز دراصل خاندان غوری سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ دولت غزنویہ کا چراغ جھلملا رہا تھا اور ''غور'' کی پہاڑیوں سے ایک نئے شاہی خاندان کا ستارہ بلند ہو رہا تھا۔

سلطنت غور کی اس چھوٹی سی ریاست کا حاکم ''معز الدین حسن'' تھا۔ حسن کے سات بیٹے تھے جو خاندان کے نام کی رعایت سے شنسب کے سات ستارے کہلاتے تھے۔ معز الدین حسن کے چھوٹے بیٹے بہا الدین سام کے دو لڑکے تھے۔ جن میں ایک کا نام غیاث الدین اور دوسرا شہاب الدین تھا۔ سام کے انتقال کے بعد غیاث الدین نے غور کا تخت سنبھالا۔

1169ء میں دونوں بھائیوں نے مل کر غزنی پر چڑھائی کی اور قبضہ کرلیا۔ پس بڑے بھائی غیاث الدین نے غزنی چھوٹے بھائی شہاب الدین کے سپرد کر دی جس نے معز الدین محمد کے لقب سے حکومت شروع کی۔ اسی شہاب الدین (جس کا لقب معز الدین محمود تھا) نے ملک گیری کے شوق میں مغربی ہند کی سرحد پر کچھ علاقے فتح کیے اور بعض ''قطر خطائی'' قبائل بھی اس کے تابع ہو گئے لیکن وسط ایشیا میں اس وقت تک خوارزم شاہی اور قرا خطائی حاوی تھے۔ اس طرح اگر فتوحات کا سلسلہ شروع ہوسکتا تھا تو اس کی سمت مشرق جانب ہند ہی ہوسکتی تھی۔

اس لئے 1175ء میں اس نے جنگوں کا سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے شہاب الدین نے ملتان کا رخ کیا۔ ملتان پر اس وقت ''قرامطی'' قابض اور حاکم تھے۔ قرامطہ دراصل خوارج (خارجی) کا ایک گروہ یا فرقہ ہے۔ چونکہ قرامطہ اور خوارج کا تعلق زمانہ قدیم سے ہے اس لئے ہم خوارج کی تفصیل کے لئے پرانی تاریخ کی ورق گردانی کرنے پر مجبور ہیں۔

خوارج (قرامطہ)

اس سلسلے میں ہم آپ کو جنگ صفین کی طرف لئے چلتے ہیں کیونکہ یہ فرقہ اسی زمانہ میں وجود میں آیا تھا۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے:۔

جنگ صفین کے بعد حضرت علیؓ کی فوج سے ایک گروہ علیحدہ ہو کر بغاوت پر مائل ہوا۔ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ صرف حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت درست تھی اور حضرت عثمانؓ کی خلافت بھی کسی حد تک ان کے لئے موزوں تھی لیکن حضرت علیؓ کی وجہ سے انہیں عداوت ہو گئی تھی اور حضرت علیؓ سے انہوں نے جنگ بھی کی تھی اور اس میں ان کی کثیر تعداد کام آئی جس کی بنا پر خارجیوں کا گروہ اور زیادہ مخالف پر اتر آیا۔

اس حقیقت کا پس منظر عبداللہ رازی یوں بیان کرتے ہیں:۔

(ترجمہ)

طلحہؓ، زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ کے حضرت علیؓ کی مخالفت شروع کر دی تھی

اور جنگ جمل میں یہ معاملہ کسی حد تک طے ہو گیا۔حضرت معاویہ کو جنہیں حضرت عثمانؓ نے شام کا حاکم مقرر کیا تھا۔ جب پتہ چلا کے حضرت علیؓ اس کو غیر پسند یدگی کی وجہ سے معزول کرنا چاہتے ہیں تو معاویہ نے ان کی خلافت سے ہی سر کشی کی جس کا نتیجہ ہوا جنگ ۔38ھ ءمیں جنگ صفین میں حضرت علیؓ نے اپنے دشمنوں کو حتمی طور پر نیچا دکھایا۔لیکن اس کے بعد ان کی مخالفت کا مواد چپکے چپکے ہی پکتا رہا۔ چونکہ ان لوگوں نے حضرت علیؓ کی اطاعت سے اخراج کیا اس لئے یہ سب خارجہ کہلائے ۔

خوراج کا ایک نعرہ یہ تھا

''لاحکم الا اللہ''

یعنی انہیں کسی خلیفہ یا امام کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام ان کے لئے کافی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے کامیاب زندگی گزارنے کے لئے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

پس یہ لوگ حضرت علیؓ کے در پے رہے۔ یہاں تک کے خوارج میں سے ایک خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم نے ماہ رمضان کی انیس تاریخ کو کوفہ کی مسجد میں دوران نماز نہایت بز دلی سے حضرت علیؓ پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے زخم کھانے کے تیسرے دن ہی اکیس رمضان کو جام شہادت نوش فرمایا:

اس واقعہ کے بعد بھی خوارج کی شورشیں ختم نہ ہوئیں اور انہوں نے

اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔کوفہ کو انہوں نے اپنا مرکز بنایا اور یہاں پر وہ اس قدر زور پکڑ گئے کہ انہوں نے ارباب اختیار کو بھی بے بس کر دیا:

جیسا کہ اب بیان کیا گیا ہے کہ ان کا نعرہ تھا:

''لا حکم الا اللہ''

چنانچہ وہ کسی دور میں بھی کسی خلیفہ کے وجود کو برداشت نہ کر سکے تھے۔لیکن خلفائے بنوامیہ اور بنوعباس نے ڈٹ کر انہیں کچلنے کے لئے انتظامات کئے۔

مغیرہ بن شعبہ جب والئی کوفہ ہوئے تو انہوں نے اعلان فرمایا:

''جس قبیلہ میں کوئی خارجہ پایا گیا تو اسے سخت ترین سزا دی جائے گی۔ سرداران قبائل نے مغیر بن شعبہ کے ساتھ تعاون کا ذمہ لیا۔خوارج نے جب یہ حالات دیکھے تو شہر سے کھسکنا شروع کر دیا۔مغیرہ نے ان کا پیچھا کیا اور انہیں بار بار دبانے کی کوشش کی۔یہاں تک کہ خوارج کا زور ٹوٹ گیا کہ ایک مدت تک ان کا نشان بھی نظر نہ آتا تھا۔لیکن اموی دور ہی میں عبیداللہ زیاد کے زمانہ میں یہ لوگ اچانک رونما ہوئے۔اور ان کے ساتھ معکروں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

عبدالملک بن مروان اور عبداللہ بن زبیر کے زمانہ میں خوارج کا اثر عراق، یمن اور بحرین میں پھیل گیا۔ان لوگوں کی بیخ کنی کے لئے مہلب بن ابی صفرہ اس زمانہ میں متعین رہے لیکن یہ تاریکی پھیلتی ہی گئی۔

مروان ثانی بن محمد بن مروان کے عہد میں خوارج نے دیکھا کہ مروان خود شام کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف ہے اور عراق میں سخت بدامنی ہے۔اس

بدانتظامی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ابن الوقت سردار ضحاک نے کوفہ پر قبضہ جمایا تو دوسری طرف مروان نے عراق میں شاہ عبدالعزیز کو معزول کر کے عراق کا تاج اپنے سر سجالیا۔ یہ دیکھ کر ضحاک نے کوفہ پر قبضہ جمالیا تو دوسری طرف مروان نے عراق میں شاہ عبدالعزیز کو معزول کر کے عراق کا تاج اپنے سر سجالیا۔ یہ دیکھ کر ضحاک راستے سے ہٹ گیا۔

پھر بھی ضحاک کو اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا پس اس نے ملک شام کی طرف قدم بڑھائے۔ اس وقت مروان نے اس کا راستہ روکا۔ دونوں میں ایک مختصر جنگ ہوئی جس میں ضحاک مارا گیا مگر اب بھی خوراج کی طاقت قائم تھی لیکن وہ زیادہ دن تک اپنی طاقت برقرار نہ رکھ سکے اور انہیں آخر کار میدان سے ہٹنا پڑا۔ اسی وقت یزید بن عمر ہبیر کو بھگوڑوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔ ان لوگوں نے یزید بن عمر بن ہبیرہ کو عراق کی سرحد سے نکال دیا۔

ادھر ایک خارجہ سردار ابوحمزہ نے مکہ کے شہر پر قبضہ کرلیا' پھر اس نے مدینہ کا رخ کیا۔ مدینہ سے کچھ فاصلہ پر اہل مدینہ اور خارجیوں کی جنگ ہوئی۔ اگرچہ مدینہ والوں کو بہت سی قربانیاں دینا پڑیں لیکن اس قربانی سے خارجی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اسی دوران حمزہ نے سوچا کے وہ شام کی طرف لوٹے۔ ابھی وہ شام کی طرف روانہ ہی ہوا تھا کہ راستے میں مروان کے ایک لشکر سے اس کا مقابلہ ہو گیا۔ ابوحمزہ اس جھڑپ میں مارا گیا۔ اس طرح خارجیوں کا زور ایک مرتبہ پھر ٹوٹ گیا۔

عباسی دور میں خوارج نے ایک مرتبہ پھر فساد برپا کیا لیکن موسیٰ الہادی نے

انہیں ایسی شکست دی کہ وہ پھر اٹھنے کی ہمت ہی نہ کر سکے۔ جہاں تک ان کے کردار کا تعلق ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے وہ وفادار ''محنتی'' زہد پسند اور عبادت گزار تھے ان کی زیادہ تاکید خوبی اعمال پر ہوتی تھی اس لئے ان کا قول تھا:۔

اصلاً امام کی ضرورت نہیں لیکن ان کی تجویز کو کوئی اہمیت نہ حاصل ہوئی۔ان کا خیال تھا کہ اگر امام کالانا بہت ضروری سمجھا جاتا ہے تو اس کے لئے لازمی نہیں کہ وہ ایک ہی خاندان کا فرد ہو بلکہ امام کسی بھی قوم سے کوئی بھی شخص ہوسکتا ہے۔جب تک امام درست ہے اس وقت تک اس کی تقلید لازمی ہے مگر جب سمجھ لیا جائے کہ امام اب راہ راست سے بھٹک گیا ہے تو اسے معزول یا قتل کر دینا چاہئے۔

خارجی جس کے پیچھے لگ جاتے تھے اس سے توبہ کروا کے ہی چھوڑتے تھے۔خارجیوں کے قول کے مطابق مخالفین کے معصوم بچوں کو ہلاک کر ڈالنا بھی جائز تھا۔ان سب باتوں کے باوجود یہ لوگ بڑے زاہد اور عبادت گزار تھے مگر ان کے دل بے حد تنگ اور وہ بے حد سنگ دل تھے۔

بعد میں خوارج مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔جن میں سے مندرجہ ذیل بہت مشہور ہوئے:

نمبر 1 فرقہ ازارقہ:۔ اس فرقہ کے لوگ نافع بن الارزق کے مقلد تھے۔

نمبر 2 فرقہ النجدات:۔ اس فرقہ کے لوگ نجدۃ بن عامر کے مقلد تھے۔

نمبر 3 فرقہ اباضیہ:۔ یہ فرقہ عبداللہ بن ریاض الت جیمی سے منسوب ہے۔

نمبر 4 فرقہ صغریہ:۔ یہ فرقہ زیاد بن الاصغر سے منسوب ہے۔

نمبر 5 فرقہ یذیدیہ:۔

نمبر 6 فرقہ مجاردہ:۔

''قرامطہ''

سرزمین میں کوفہ میں 278ھ میں ایک شخص حمد ان جس عرف ''قرمط'' تھا نے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔ اس کے عقیدے کے مطابق امام بارہ کے بجائے صرف سات ہیں:۔

نمبر 1 حضرت اما حسین علیہ السلام

نمبر 2 حضرت اما علی بن زین العابدین اما حسین

نمبر 3 حضرت امام جعفری صادق علیہ السلام

نمبر 4 حضرت امام باقر بن علی بن حسین علیہ السلام

نمبر 5 حضرت اسمعیل بن جعفری بن محمد علی بن حسین علیہ السلام

نمبر 6 حضرت محمد بن اسمعیل بن جعفر صادق علیہ السلام

نمبر 7 حضرت عبید اللہ بن محمد بن اسمعیل بن جعفر صادق علیہ السلام

حمد اپنے آپ کو عبید اللہ بن محمد کا نائب کہتا تھا۔ محمد الحنفیہ بن علی بن ابی طالب کو وہ رسول کا درجہ دیتا تھا۔ چنانچہ اس نے اذان میں یہ الفاظ

بڑھائے:۔

''اشھد ان محمد بن حنفیہ رسول اللہ''

اس نے بیت المقدس کا قبلہ قرار دیا۔ جمعہ کے دن کے بجائے پیر کا روز ہفتہ میں بابرکت قرار دیا اور اس دن کوئی کام نہ کرتا تھا۔ نہ اپنے پیروکاروں کو کرنے دیتا تھا۔ نیند کو حرام اور شراب کو حلال قرار دیتا تھا۔ غسل جناب کو غیر ضروری سمجھتا تھا۔ جو شخص قرامطہ کا مخالف ہو اس کو قتل کرنا واجب قرار دیتا تھا۔ اپنا لقب ''قائم الحق'' رکھا تھا۔

قرمط نے جب اپنے مذہب کا آغاز کوفہ میں کیا تو کوفہ کے عامل نے اسے گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا لیکن وہ کسی صورت جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ حمدان نے اپنی رہائی کو ''کرامت'' کا نام دیا اور لوگوں میں مشہور کیا کہ کوئی شخص مجھے گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے معتقدین میں بڑے بڑے اہل کار، طبیب، تاجر اور تعلیم یافتہ لوگ شامل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہر وقت ایک بڑی جماعت عقیدت مندوں کی رہتی تھی۔

صوم و صلوٰۃ کے بارے میں اس نے بتایا کہ اللہ تعالٰی نے ان کے رسول پر پچاس نمازیں نازل کی ہیں اور روزے حسب سابق (یعنی 30 دن)۔ حمدان قرمط نے عبید اللہ بن مہدی سے سرکشی کی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ غالباً اسی کی پاداش میں وہ ہلاک ہوا۔ اس کے بعد اس کی بہنوئی ''عبدان'' جانشیں ہوا۔ اسے بھی عبید اللہ المہدی نے مروا دیا۔ عبدان کے عہد تک یہ تحریک گردونواح کی وادیوں میں پھیل گئی۔

کچھ دنوں کے بعد ان لوگوں کے عقائد میں بڑی تیزی سے تبدیلی آئی۔ مثلاً پچاس نمازوں کے بجائے صرف چار رکعت نماز فرض رہ گئی۔ دو رکعت نماز قبل طلوع آفتاب اور دو رکعت نماز غروب آفتاب کے بعد۔ ان لوگوں نے نہایت بری قسم کی اشتراکیت کا رسول وضع کیا اور اس اصول کا نام ''الفت'' رکھا۔ یہ تحریک محمد بن اسمعیل کے نام سے پروان چڑھی۔

قرامطہ کی وجہ تسمیہ میں یہ دلائل دیئے جاتے ہیں:

نمبر 1 حمدان کوفہ میں اپنے بیلوں کے ذریعہ غلہ ڈھونڈ تا اس لئے اس کو:

کریتہ یا قرمت یعنی بیل پر سوار ہو کر آنے والا کہا گیا۔ پھر یہ لفظ قرمطہ بن گیا جو آہستہ آہستہ قرمط رہ گیا۔

نمبر 2 قرموطہ کے معنی ہیں۔ مکار۔ فریب دینے والا۔

یہ نام مخالفین نے دیا۔

نمبر 3 کرمیتہ یا کرموطہ۔ جنوبی عراق میں کاشتکار کو کہتے ہیں۔ حمدان کے اہل خانہ۔ تمام کے تمام سب کاشتکاری کرتے تھے۔

نمبر 4 قرمط۔ عربی زبان میں تنگ تنگ لکھنے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کے چلنے کو کہتے ہیں۔ حمدان کی چال میں کچھ ایسی تیزی نہ تھی۔ اس بنا پر اسے قرمط کہنے لگے۔

نمبر 1 قرامطہ شمالی۔ ذکرویہ بن مہرویہ اور اس کے بیٹے ان کے سربراہ رہے۔ (یہ شاخ، عراق اور شام کے علاقوں سے متعلق تھی)۔

نمبر 2 جنابیہ۔ابوسعید جنابی اور اس کی اولاد اس شاخ کی قیادت کرتی رہی۔یہ شاخ بحرین احسار اور ''ہجر'' کے علاقوں سے متعلق تھی۔

قرامطہ شمالی:۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ عراق اور شام میں اس فرقے کے جو لوگ آباد تھے۔ان کی قیادت زکرویہ بن مہرویہ کر رہا تھا۔اس کے چار بیٹے تھے۔(1) یحیٰ بن زکرویہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی اونٹنی خدا کی طرف بھیجی گئی ہے۔یحیٰ کو الشیخ بھی کہتے ہیں۔یہ 390ھ میں مارا گیا۔

(2) احمد بن زکرویہ:۔

(3) نمبر (1) نمبر (2) دونوں اس فرقہ کے پبلسٹی آفیسر تھے۔

نمبر 4 حسین صاحب الخال یا صاحب الشام۔

اس کے چہرے پر ایک تل تھا۔وہ لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ میرے چہرے تل (خال) خداوندی ہے۔اس لئے لوگ اسے صاحب الخال کہتے تھے۔انہیں صاحب الشام کے نام سے بھی پکارتے تھے۔انہیں ان کے بڑے بھائی کے قتل کے ایک سال بعد قتل کر دیا گیا۔

زکریہ بن مہرویہ بذات خود روپوش ہوگیا تھا اور بارہ برس تک روپوش ہوگیا تھا اور بارہ برس تک روپوش رہا۔

اس عرصہ کے دوران مذہب کا پرچار اس کے چاروں بیٹے کرتے رہے۔

آخر کار 291ء میں اس کا آخری بیٹا حسین صاحب الشامہ بھی قتل ہو گیا تو اسے بہت رنج ہوا۔ چنانچہ 293ھ میں وہ خود پھر رونما ہو گیا لیکن اگلے ہی سال یعنی 294ھ قتل ہو گیا۔

جنابیہ:۔

281ھ میں ایک شخص یحییٰ بن مہدی نے اعلان کیا کہ مہدی موعود کا ظہور ہونے والا ہے۔ انہوں نے مجھے اپنا داعی بنا کر بھیجا ہے۔ اس کے ایک پیروکار ابو سعید حسن بن بہرام جو خلیج فارس کے ایک ساحلی گاؤں "جنابہ" کا رہنے والا تھا، اس نے یحییٰ بن مہدی کی جگہ قیادت سنبھالی۔

سعید حسن بن بہرام نے اپنی طاقت اس قدر بڑھائی کے چند ہی سال کے اندر یونی 287ھ تک عراق کے زیریں علاقے اس کے اقتدار میں آ گئے اور شاہی فوج کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ حسن بن بہرام 301ھ میں اپنے ایک غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ باپ کے بعد اس کے بیٹے "سعید" نے فرقہ کی قیادت سنبھالی اور اس تحریک کو از سر نو وسعت دی۔ اس نے دارالہجرت بنایا اور اس نے کئی بار حاجیوں کا راستہ روک کر انہیں خراب کیا۔ پھر اس راستے پر چلتے ہوئے اس نے 317ھ میں ایک زبردست گروہ کے ساتھ مکہ معظمہ پر حملہ کر دیا۔ اس نے پورے شہر کو لوٹا۔ بے شمار حاجی اس کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ اس کم بخت نے خانہ کعبہ کا دروازہ اکھاڑ دیا اور سنگ اسود کو دیوار سے نکال لیا۔ اس طرح سنگ سود بائیس سال تک کعبہ سے غائب رہنے کے بعد خلیفہ کے حکم سے بازیاب کرا کر اس کی جگہ

دوبارہ نصب کیا گیا۔ 332ھ میں ابو طاہر بن سلیمان نے وفات پائی۔

ابو طاہر کے بعد قرامطہ کا زور کچھ کم ہوا۔ پھر اس کے بعد حسن بن احمد نے قرامطہ کی قیادت سنبھال لی اور بنوعباس کے اکسانے پر مصر پر حملہ کیا جہاں اس وقت بنوفاطمہ برسر اقتدار تھے۔ انہوں نے قرامطہ کوشکست دے کر بھگادیا۔

قرامطہ کی تحریک ایک عرصہ دراز تک چلتی رہی۔ یہاں تک کہ 455ھ (تقریباً ایک صدی بعد) تک وہ قابض رہے مگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ لوگ (قرامطی) مصلح نہیں بلکہ مسلح ڈاکو تھے۔ یہ غاصب اور بے رحم تھے۔ ان کو دین سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کا مقصد دولت جمع کرنا تھا جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے اوران کے زمانہ میں وہاں دولت کے انبار لگ گئے۔

''بابک خرمی''

اسی طرح ایک بے دین ''بابک خرمی'' تھا۔ اس کا ظہور خلیفہ مامون رشید کے زمانہ ہوا تھا۔ اس دور میں ایک شخص علی بن صدقہ زریقہ نے آرمینیا اور آذربائیجان میں ظہور کیا تھا۔ وہ مامون کی طرف سے اس علاقہ کا گورنر تھا مگر جب شاہی کا شوق چرایا تو اس نے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا۔

پھر اس دور میں ایک شخص جاویدان مجوسی نے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔ اس مذہب کی خوبیاں یہ تھیں کہ اس کے زمانہ میں قتل وخوں اور زنا کاری کوئی جرم نہیں تھا۔ یہ مذہب مزدکی مذہب اور عقائد سے ملتا جلتا تھا۔ جاویدانی کا سب سے بڑا اور معتبر شاگرد اور مرید بابک خرمی تھا۔

جاویدان کی وفات کے بعد بابک خرمی نے اس مذہب کے پیشوا ہونے کا اعلان کر دیا۔ آذربائیجان اور آرمینیہ کے عوام نے بابک خرمی کے دلائل سن کر اس مذہب میں جوق در جوق شمولیت اختیار کی۔ جب یہ لوگ بہت قوت حاصل کر گئے تو پھر ان کا پروگرام ہی بدل گیا۔ یہ لوگ ڈکیتی اور راہزنی میں لگ گئے بلکہ آذر بائیجان میں بابک نے اپنے آپ کو خودمختار حکمران قرار دیدیا اور بہت سے لوگ اس کے حامی اور ساتھی بن گئے خلیفہ مامون رشید ہی کے زمانہ میں خلیفہ نے اپنے ایک جرنیل محمد بن حمید کو بابک خرمی کی سرکوبی پر مامور کیا۔ ان دونوں میں شدید جنگ ہوئی جس میں بابکی پہاڑوں کی اوٹ سے حملہ آور رہوا۔ خلیفہ کا جرنیل اس جنگ میں مارا گیا۔ اس کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ اس سال خلیفہ نے اپنے دوسرے جرنیل عبداللہ بن طاہر سے بلا کر ''پر حملہ کا حکم دیا۔ لیکن اس دوران نیشا پور میں خوارج نے فساد شروع کر دیا اور عبداللہ بن طاہر کو اس طرف روانہ کیا گیا۔ بابک خرمی کا ستارہ عروج پر تھا۔ اس کے خلاف کئی مہمیں بھیجی گئیں مگر کوئی کامیاب نہ ہوئی۔

بابک خرمی کو جب شکست کا سامنا ہوتا تو وہ پسپا ہو کر بھاگ کے اپنے مرکز میں چھپ جاتا۔ بابک خرمی نے دراصل ''برزند'' کی پہاڑیوں میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا تھا جس پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ آخر خلیفہ نے اپنے ایک سردار ابوسعید محمد بن یوسف کو بلا کر بابک کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کا حکم دیا۔

دونوں کے درمیان زبردست معرکہ ہوا جس میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ آخر بابک خرمی کو اس جنگ میں شکست ہوئی لیکن وہ گرفتاری سے بچ نکلا

کیونکہ بز رند کی پہاریوں میں دشوار گزار راستے تھے جب کو کسی شنا سا کے بغیر عبور نہ کیا جا سکتا تھا۔آخر نئے سپہ سالار ابوسعید محمد بن یوسف نے نہایت حکمت عملی سے بابک کے مریدوں اور تربیت یافتہ لشکر کو ''بر زند'' میں جا گھیرا۔وہاں دونوں کے درمیان بڑا قیامت خیز معرکہ ہوا جس میں کشتوں کے واقعی پشتے لگ گئے۔اس دفعہ پھر بابک خرمی کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا مگر اس شکست میں بابک خرمی گرفتار نہ ہو سکا کیونکہ وہ ان پہاڑوں کے تمام خفیہ راستوں سے واقف تھا اور وہاں پہنچ کر غائب ہو جاتا تھا۔

اس دوران آذر بیجان کے ایک قلعہ دار محمد بن بعیث نے بابک خرمی کے ایک سردار عصمت کو گرفتار کرلیا اور اسے پابہ زنجیر کر کے خلیفہ معتصم باللہ کے دربار میں روانہ کیا۔خلیفہ نے عصمت کے گرد سخت پہرہ لگا دیا مگر اسے بظاہر بالکل آزاد کر دیا۔اس دوران عصمت نے فرار ہونے کی کئی کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ادھر خلیفہ بار بار عصمت کو آزادی دینے کا لالچ دے کر اس سے پہاڑی راستوں کا پتہ بتانے کا حکم دیتا بلکہ کبھی کبھی درخواست تک کرتا مگر عصمت خلیفہ کے جال میں نہ پھنس سکا۔

آخر عصمت کو گرفتاری کی حالت میں خلیفہ کے پاس شدید پہرے میں بھیجا گیا۔عصمت کی یہ گرفتاری طویل ہوتی چلی گئی جس سے عصمت ایک طرف تو دوسری طرف خلیفہ بھی پریشان ہو گیا۔آخر اس جھگڑے کا یہ نتیجہ نکلا کہ عصمت نے خلیفہ کے رہائی کے وعدے پر پہاڑی راستوں کا پتہ خلیفہ کو بتا دیا اور خلیفہ کے آدمیوں کو ساتھ لے جا کر ان راستوں کی نشاندہی کر دی۔

اس طرح خلیفہ نے ان تمام خفیہ راستوں پر سخت پہرہ لگا دیا۔ اور آخر افشیں حیدر کی زبردست فوجی قابلیت کی بنا پر بابک خرمی جیسا چالاک اور عیار شخص مع اپنے بھائی معاویہ کے گرفتار ہو گیا۔ یہ واقعہ 322ھ کا ہے۔ افشیں حیدر نے بابک کو سخت پہرے میں معتصم باللہ کے دربار میں بھجوایا تھا۔ خلیفہ نے حکم جاری کیا کہ برزند سے لے کر سامرہ تک افشیں حیدر کو خلیفہ کی طرف سے ہر منزل پر ایک خلعت اور ایک ساز و سامان سے آراستہ براق نما گھوڑا پیش کیا جائے۔ جب افشیں سامرہ کے قریب پہنچا تو خلیفہ معتصم نے اپنے بیٹے واثق کو شہر سے باہر آ کر استقبال کے لئے روانہ کیا' پھر جب افشیں خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوا تو خلیفہ نے اسے کرسی زر پر بٹھا کر ایک خوبصورت تاج اس کے سر پر رکھا۔ اس کے علاوہ ایک نہایت قیمتی خلعت اور بیس لاکھ درہم بطور انعام اسے عطا کئے۔

خلیفہ نے بابک خرمی کو ہاتھوں پر بٹھا کر سارے شہر سامرہ میں پھرایا پھر اس کے ہاتھ پاؤں کٹوائے اور سر قلم کرایا اور پیٹ چاک کرنے کا حکم دیا۔ اس کا سر خراساں بھجوایا اور جسم کا سامرہ ہی میں لٹکایا گیا۔ بابک کے بھائی ساویہ کو بغداد بھیج دیا گیا۔ جہاں اس کا سر قلم کیا گیا اور اس کی لاش کو صلیب پر لٹکا دیا گیا۔

بابک خرمی کا دور دورہ تقریباً بیس سال رہا۔ اس عرصہ میں اس نے ڈھائی لاکھ مسلمانوں کا خون بہایا۔ سلطان نے تقریباً آٹھ ہزار مرد اور خواتین کو اس کے چنگل سے رہائی دلائی پھر بابک گرفتار ہو کر مارا گیا لیکن ایک طویل عرصہ تک اس کا مذہب جاری رہا پھر مٹ گیا۔

ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے

سلطان محمود غزنوی کے عہد سے با قاعدہ طور پر پنجاب اور شمالی ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے شروع ہو چکے تھے۔ سلطنت غزنی کو عام بدامنی سے محفوظ رکھنے کے لئے معز الدین غوری نے پہلے بلوچستان اور سندھ کے علاقوں پر قبضہ کیا اور پھر بھائی کی فرمائش پر ملتان کو باطنیوں کی شورش سے نجات دلائی۔ اچ (اچھ) میں ایک بھاٹیہ راجہ آزاد ہو گیا تھا' اسے مغلوب کیا اور کچھ مدت بعد اس نے گجرات پر حملہ کیا مگر کامیابی نہیں ہو سکی۔ اس ناکامی سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ معز الدین کی توجہ پنجاب کی طرف مبذول ہو گئی اور چند حملوں میں یہ صوبہ اور اس کا پایہ تخت اس کے قبضہ میں آ گیا۔

اس کے چار سال بعد معز الدین (شہاب الدین غوری) نے بھٹنڈہ کا قلعہ اپنی عمل داری میں داخل کر لیا۔ اس نے اس قلعہ میں صرف گیارہ ہزار سپاہیوں کی فوج رکھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو اسے ہندوؤں کی صحیح قوت کا اندازہ نہ تھا یا وہ انہیں اپنی خاطر میں نہ لاتا تھا حالانکہ اس زمانہ میں ''چوہان خاندان'' کے راجپوت دہلی پر قابض تھے اور یہ راجہ (پرتھوی راج) بڑا منچلہ اور بہادر سپاہی تھا اور یہ بھٹنڈہ کو اپنی سلطنت میں شامل سمجھتا تھا۔

جب پرتھوی راج نے سنا کہ بھٹنڈہ پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا ہے تو وہ ایک لشکر جرار لے کر تھانیسر پہنچ گیا۔ معز الدین کسی بڑی جنگ کے لئے تیار ہو کر نہیں آیا تھا اور وہ واپس جا رہا تھا۔ مگر جب اسے ہندوؤں کے اس لشکر کی خبر ملی تو وہ فوراً

پلٹ پڑا اور ترائن (کرنال) کے میدان میں جا اترا۔

اس موقعہ پر غیاث الدین نے سرداروں کو اس طرح مخاطب کیا۔

''میرا مزید جنگ کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر جب پرتھوی راج مقابلے کے لئے آ گیا ہے تو دشمن کو پیٹھ دکھانا مسلمانوں کا شیوہ نہیں''۔

دوسری طرف ایک مسلم سردار نے ہندوؤں کے ایک بھاری لشکر کی خبر دی اور ڈرتے ڈرتے کہا۔

''اس وقت جنگ کے بجائے خاموشی سے واپس جانا ہی بہتر ہے''۔

یہی رائے ایک اور سردا نے دی۔مگر شہاب الدین نے ساف جواب دیا۔

''بغیر جنگ کے میدان سے واپس جانا مسلمانوں کا شیوہ نہیں۔''

اور اس نے واپس جانے سے قطعی انکار کر دیا۔

اس کا یہ فیصلہ اگر چہ دور اندیشی سے دور تھا اس لئے کہ اس کی فوج کے مقابلہ میں ہندوؤں کا لشکر بارہ گنا زیادہ تھا۔اندازہ کیا گیا ہے کہ پرتھوی راج کے لشکر میں دو لاکھ سوار اور تین ہزار جنگی ہاتھی تھے۔اس کے مقابلہ میں معز الدین (شاہب الدین غوری) کی فوج بارہ چودہ ہزار سواروں سے زیادہ نہ تھی۔معز الدین کو بھی اس بات کا علم تھا مگر اس نے پرواہ نہ کی۔یہ بے جا دلیری نقصان دہ ثابت ہوئی۔اگر چہ مسلمان لشکر بڑی دلیری نقصان دہ ثابت ہوئی۔اگر چہ مسلمان لشکر بڑی دلیری سے لڑا مگر اسے شکست ہوئی۔

شہاب الدین خود اتنا شدید زخمی ہوا کہ اس کا ایک وفادار غلام اس کے گھوڑے پر پیچھے بیٹھ گیا اور گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا میدان جنگ سے باہر نکل

آیا۔لاہور پہنچ کے شہاب الدین کئی ہفتے صاحب فراش رہا۔

پھر جب صحت نصیب ہوئی تو گھر کا رخ کیا۔وہ جو کسی نے کہا ہے کہ چڑیا کا بسیرا گھونسلے میں تو سلطان شہاب الدین بھی غزنی واپس گیا کہ کچھ دن آرام دے۔سلطان غوری کے لئے یہ شکست بہت تکلیف دہ ثابت ہوئی پر اسے یہ بھی عقل آئی کے بے جا دلیری فائدے کے بجائے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ بہادری اور شجاعت کے یہ معنی تو نہیں کہ انسان آنکھیں بند کر کے آگ میں کود پڑے۔

غوری اگر چہ کچھ دن صاحب فراش رہا مگر اپنے ارادوں میں ثابت قدم ہی رہا۔ جب ذرا حالت بحال ہوئی تو اس نے اس غلام کو طلب کیا جو اسے میدان جنگ میں موت کے پنجوں سے بچا کے لے آیا تھا۔

سلطان نے اپنے محسن سے کہا:

”اگر چہ احسان کا کوئی صلہ نہیں مگر تم نے جس دلیری اور بے خوفی سے مجھے موت کے منہ سے چھین کر اس قابل کیا ہے کہ میں گور میں ہونے کے بجائے تم سے گفتگو کر رہا ہوں۔اب بتاؤ کہ تمہیں انعام میں کیا دیا جائے؟“

وفادار غلام نے ادب سے سر جھکایا اور عرض کیا:

”اے میرے مالک اور تاجدار! غلام صرف اس لئے ہوتا ہے کہ وہ مالک کی حفاظت کرے اور وقت پڑنے پر اس پر نثار ہونے سے بھی دریغ نہ کرے۔اس لئے میں حضور سے اپنی خدمت کا کوئی صلہ حاصل کرنے کا حقدار نہیں۔یوں آپ مالک ہیں اور امیدوار ہوں کہ خداوند تعالیٰ مجھے اپنی بقیہ زندگی میں ایسے ہی خطر

نازک حالت میں اپنے مالک پر قربان ہونے کا موقع عطا کرے۔ زندگی اور موت دونوں خدا کے ہاتھ ہیں میں نے تو صرف حق نمک ادا کیا ہے اور خدا سے دعا ہے کہ وہ مجھے آپ پہ قربان ہونے کا بار بار موقع عطا کرے۔"

"جزاک اللہ۔ خدا نے مجھے تم جیسا وفادار غلام عطا کیا ہے۔ میں تو پہلے خداوند تعالیٰ کا شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے دشمن کی شمشیروں سے محفوظ رکھا۔ اس کے بعد میں خدا سے دعا کروں گا کہ وہ مجھے تازندگی ملک اور قوم کی خدمت کا موقع عطا کرے"۔

سلطان شہاب الدین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ اس عظیم کارنامے اور دلیری کا اپنا غلام کو کیا انعام دے۔ پس کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولا:

"اے میرے وفادار غلام، دوست اور ساتھی۔ آج سے تم غلام نہیں بلکہ میرے محسن کے طور پر ہمہ وقت میرے ساتھ رہو گے۔ الحال میں تمہیں اپنے محافظ فوجی دستے کا نائب سردار بناتا ہوں۔"

اس غلام کے اللہ کے حکم سے دن پھر گئے۔ اسے سلطان نے خاص دستے کا نائب بنانے کا ساتھ ساتھ اسے ایک بھاری انعام سے بھی نوازا۔

سلطان اگرچہ میدان جنگ سے صحیح وسلامت واپس غزنی پہنچ گیا تھا مگر اس کا دل ہر وقت بے چین رہتا تھا۔ اس شکست نے اس کا کھانا پینا حرام کر دیا تھا، چنانچہ اس نے اپنا وقت آرام سے گزارنے کی بجائے دشمن سے اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے وقت کر دیا۔ پس اس نے ایک لشکر جرار تیار کرنے میں اپنے آپ کو مشغول کر دیا اور مہینوں یا برسوں کے بجائے صرف چند دنوں میں وہ ایک عظیم لشکر

تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سلطان غوری نے جو لشکر تیار کیا اس میں صرف افغان اور ترک فوجیوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سواروں سے بھی زیادہ تھی۔

لشکر کو تیار اور کیل کانٹے سے درست کیا اور صرف کچھ دن آرام کرکے جس کے دوران وہ لشکر تیار کرنے میں بھی مصروف رہا' اس نے فوراً روانگی کا اعلان کیا اور اس عظیم لشکر کے ساتھ غزنی سے روانہ ہو کر ہندوستان میں داخل ہوا۔

لاہور پہنچ کر سلطان شہاب الدین غوری نے اپنے مخالف یعنی مہاراجہ پرتھوی راج کو ایک مختصر مگر انتہائی سخت پیغام بھیجا جس میں صرف یہ درج تھا:۔

''اسلام لاؤ ورنہ تلوار اس کا فیصلہ کرے گی''

سلطان شہاب الدین غوری کا یہ پیغام لشکر کنار میں کیا پہنچا کہ وہاں جیسے آگ لگ گئی۔ اس نے سلطان کو جواب میں لکھا:

''ہماری فوج کی تعداد تمہاری فوج کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ تم ہمارے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتے لیکن ہم تمہیں حفاظت سے واپس جانے کی اجازت دے سکتے ہیں بشرطیکہ تم اپنے اس فعل پر ندامت اور شرمساری کا اظہار کرو۔''

سلطان معز الدین (شاہاب الدین) غوری نے پرتھوری راج کے خط کا صرف اس قدر جواب لکھا:

''میں اپنے بھائی کا سپہ سالار اور نمائندہ ہوں اور یہ پیغام اس تک پہنچا دوں گا اور وہاں سے جو جواب آئے گا اُس پر عمل کیا جائے گا۔''

راجپوتوں کو اپنے لشکر پر بہت غرور تھا چنانچہ انہوں نے سلطان کے اس

جواب کا غلط مطلب نکالا وہ نہ صرف اس جواب سے مطمئن ہو گئے بلکہ انہوں نے سمجھ لیا کہ سلطان، راجپوتوں کے لشکر کا حال سن کر گھبرا گیا ہے اور طرح طرح کے حیلے بہانے تلاش کر رہا ہے اس لئے وہ بالکل مطمئن ہو کے بیٹھ گئے۔

مگر پھر جب ایک صبح کو مسلمانوں کے لشکر میں ''طبل جنگ'' پر چوٹ پڑی اور دور سے مسلمانوں کے سرخ و سیاہ پرچم جن پر ''نصر من اللہ'' جلی حروف میں لکھا ہوا تھا، انہیں دکھائی دیئے تو وہ نہ صرف حیران ہوئے بلکہ ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ جلدی جلدی صفیں باندھ کے میدان جنگ میں آ گئے۔ راجپوتوں نے بڑی پھرتی اور چستی دکھائی مگر سلطان غوری اس دفعہ پوری طرح تیار ہو کر آیا تھا۔

پس جنگ شروع ہوئی اور سلطان دلیر اور بہادر سوار، راجپوتوں پر بھوکے شیروں کی طرح ٹوٹ پڑے اور ان کی صفیں کی صفیں الٹ کے رکھ دیں۔ پرتھوی راج کے جنگی ہاتھی مسلمانوں کو روکنے کی بہت کوشش کر رہے تھے مگر مسلمان سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح دشمن کے سامنے ڈٹے ہوئے تھے۔ ہاتھیوں کی جھلوں میں جو آئینے لگے تھے وہ سورج کی کرنوں سے چمک چمک کر آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے مگر مسلمان ان ہاتھیوں سے قطعی خوفزدہ نہ تھے بلکہ حالت یہ ہو گئی تھی کہ ہاتھی بھی مسلمان تیر اندازوں کے تیروں سے تنگ آ گئے تھے۔ پھر راجپوت فوج سمٹ سمٹ کر درمیان میں جمع ہونے لگی۔ وہ اب آگے بڑھ کر حملہ کرنے کے قابل نہ رہی تھی۔

سلطان شہاب الدین غوری ایسے ہی موقعہ کی تاک میں تھا۔ اس نے فوج

خاصہ جسے جنگ سے اب تک الگ رکھا گیا تھا' کو حملہ کا حکم دیدیا۔ اس طرح بارہ ہزار سوار دشمن کے لشکر کے قلب پر آ کر گرے۔ یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ راجپوت اس کی تاب نہ لا سکے۔ ان کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ ہر طرف میدان میں بھاگنے لگے۔ کوئی ستر اسی ہزار دشمن سوار اس جنگ میں ہلاک ہوئے۔ پرتھوی راج نے بھی بھاگ کے جان بچانے کی کوشش کی مگر دشمن کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ وہ ہر طرف بھاگ رہے تھے اس بھاگ دوڑ سے فائدہ اٹھا کر پرتھوی راج بھاگ نکلا مگر مسلمانوں نے اسے تعاقب کر کے جالیا اس خاتمہ کر دیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو راجے' مہاراجے اور راجکما اس جنگ میں مارے گئے۔ سلطان شہاب الدین نے اس جنگ میں بڑا کمال دکھایا۔

یہ راجپوتوں کی مکمل شکست تھی اور اس جنگ نے صحیح معنوں میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ اور مسلمانوں کو اجمیر اور دہلی کا مالک بنا دیا۔ یہ ہند میں اسلامی حکومت کا آغاز تھا جس نے مسلمانوں کی حکومت کی سرحدیں کئی ہندو ریاستوں سے ملا دیں۔ ان سب میں قنوج کا راجہ بہت طاقتور تھا۔ اس راجہ کا نام ''جے چند'' تھا۔ اس کے پاس کئی لاکھ پیادہ اور تیس ہزار زرہ پوش سواروں کی فوج تھی۔ پس اس نے مسلمانوں سے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

جب سلطان غوری کو راجہ جے چند کی جنگی تیاریوں کی اطلاع پہنچی تو اس نے بھی راجہ جے چند سے مقابلے کی تیاریاں شروع کیں اور لشکر لے کر ہندوستان آیا۔ سلطان غوری اور راجہ جے چند کے درمیان ''چندوال'' کے مقام پر ایک عظیم جنگ ہوئی جس میں راجہ اپنی جان بچا کر بھاگا مگر سلطان کے ہاتھ نہ آیا جس سے

اندازہ لگایا گیا کہ وہ مارا گیا ہے یا بھاگ نکلا ہے۔

اس جنگ کے نتیجے میں سلطان شہاب الدین کا قبضہ نہ صرف ''قنوج'' پر ہو گیا بلکہ دوآبہ کا پورا علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ اس جنگ عظیم کے بعد سلطان غوری کو پھر ہندوستان آنے کی فرصت نہ ملی۔ اس کے بھائی غیاث الدین انتقال ہو گیا تو غور کی پوری حکومت اس کے ہاتھ آ گئی اور وہ سلطان اعظم شہاب الدین غوری کے نام نامی اور اسم گرامی سے ملقب ہوا۔ اس وقت سے اس نے شمالی ھند کی جنگوں کا سلسلہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔

پھر جب اسے معلوم ہوا کہ دریائے چناب اور جہلم کے درمیان بسنے والے نیم وحشی کھوکھروں نے بہت سر اٹھایا ہے اور وہ والئی لاہور کے قابو میں نہیں آتے تو فوراً غزنی سے پشاور آیا اور ان وحشیوں کا اچھی طرح مزاج درست کیا۔ اس کے نتیجے میں کھوکھروں کے سرداروں نے باہم جمع ہو کر سلطان سے امان اور معافی مانگی اور مال گزاری کی بقایا تمام رقمیں ادا کیں۔ پھر سلطان نے انہیں آئندہ احتیاط کے وعدے پر معاف کر دیا۔ مگر اب یہ مسلمان کے لئے ایک عظیم صدمہ تھا کہ اس عظیم سلطان کو چند طنی فدائیوں نے سوتے میں شہید کر دیا۔

ہم یہ پہلے کہہ چکے ہیں کہ سلطان غوری' سلطان محمود غزنوی کی طرح کامیاب سلطان نہ تھا مگر اس کا بہت اچھا بدل اور مقلد تھا۔ اور سلطان شہاب الدین غوری' ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک تھا۔

جہاں تک اس کے ذاتی اوصاف کا تعلق ہے' سب مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ وہ نہایت خدا ترس' عادل' فیاض بادشاہ تھا۔ وہ غلاموں پر بے حد شفقت کرتا

تھا۔وہ انہیں اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا۔

سلطان شہاب الدین غوری لاولد تھا۔اس بناپر ایک دن ایک امیر نے کہا:

''کاش اللہ تعالیٰ نے اسے فرزند عطا کیا ہوتا جو اس وسیع اور عظیم سلطنت کاوارث ہوتا''۔

سلطان غور نے امیر کے اس اظہار کا ان الفاظ میں جواب دیا تھا:

''بادشاہوں کے صرف چند بیٹے ہوتے ہیں مگر مجھے خدا نے بیسیوں بیٹے دیئے ہیں یہی میرے بعد سلطنت کے وارث ہوں گے اور میرا نام روشن کریں گے۔''

چنانچہ بالکل ایسا ہی ہوا۔

ہندوستان میں غزنوی سلطنت مسلمانوں کا سب سے بڑا سہارا تھا۔مگر جب غزنوی سلطنت میں ضعف آیا تو غیاث الدین اور شہاب الدین دونوں بھائی غور کے خاندان سے نکل کر تخت غزنی پر قائم ہو گئے۔ان دونوں بھائیوں میں غیاث الدین تو تاجدار تھا اور شہاب الدین سپہدار (سردار) ہوکر بڑے بھائی کی اطاعت کا حق ادا کرتا تھا۔

شہاب الدین نے غزنی سے ہند آ کر کئی معرکے مارے۔انہوں نے بھٹنڈہ کے قدیم راجگان پر فوج کشی کی اور کامیاب ہوئے۔پھر سب بندوبستوں سے فارغ ہو کر ایک دن دربار عام کیا امیر و وزیر،سپہ سالار،بخشی سب اپنے اپنے عہدوں پر حاضر تھے۔گفتگو یہ ہورہی تھی کہ دارالخلافہ چننے کے لئے کونسی تاریخ مقرر کی جائے کہ دفعتاً سرحد کے سردار کا عریضہ پہنچا کہ اجمیر کا راجہ اپنے بھائی

کمانڈے راؤ حاکم علی کو ساتھ لے کر دو لاکھ فوج جرار اور تین ہزار فیل جنگی سے بھٹنڈہ کو چھڑانے آندھی اور طوفان کی طرح اڈا چلا آ رہا ہے تو بادشاہ نے اس وقت لشکر اسلامی میں منادی کرادی کہ جب تک اس مہم کا فیصلہ نہ ہو جائے غزنی کا رخ کرنا مناسب نہیں۔ اس کے ساتھ ہی لشکر کی تیاری کا حکم اور رستے کے کارکنوں کے نام سامان رسد کے حکم نامے جاری ہوئے۔ اس طرح لشکر جرار منزل بہ منزل یلغار کرتا جاتا تھا۔ انبالہ کے ڈیروں میں خبر لگی کہ راجہ کا لشکر پانی پت کے مقام پر ہے مگر فیل خانہ کرنال پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے وہیں مقام کر دیا اور فوج کو پس و پیش سے درست کر کے پھر کوش کرتا ہوا آگے بڑھا۔ یوں دونوں لشکروں کا میدان ترائن (تلاوڑی) میں آمنا سامنا ہوا۔

دن تو مورچوں کی درستی میں گزرا۔ شام کو سب نے گھوڑوں کے تنگ ڈھیلے کر دیئے اور دانہ چڑھا اور زین پوش بچھا کر بیٹھ گئے۔ باگ ڈوریں زانوؤں سے باندھ لیں اور خورجیوں سے روٹیاں نکال کر کھانے لگے۔ سلطان ابھی کھانے ہی میں مشغول تھا کہ گشت کے سواروں نے دشمن کی فوج کے کچھ گھسیارے اور لکڑہارے جنگل سے پکڑ کے حاضر کئے۔

سلطان نے سواروں کو تو انعام دے کر رخصت کیا اور پکڑے جانے والوں کو کھانا کھلانے کا حکم دیا۔ جب آدھی رات گزری تو انہیں سامنے بلایا۔ وہ سب سب جنگلی گنوار تھے مگر ان میں دو بڈھے ہشیار اور تجربہ کار نکلے۔ سلطان نے ان سے دشمن کے اتار کا رخ، فوج کی تعداد، پیچھے کی مدد، رسد کا بندوبست، غرض یہ کہ ڈیرے ڈیرے کا حال معلوم کیا۔ وہ ساری رات فوج کی تقسیم اور مورچوں پر فوج

کی تعیناتی میں کئی پھر پچھلے پہر رات کو کمر بندی کا حکم پہنچا اور صبح ہوتے ہوتے تمام لشکر کیل کانٹے سے لیس ہو کے میدان میں آ پہنچا۔ آگے پیچھے دائیں بائیں ہر ایک سردار اپنی فوج سنبھالے تھا اور خود صاحب لشکر (سلطان) زرہ بکتر، چار آئینہ سجے سر پر خود فولادی کمر میں شمشیر اصفہانی، پشت پر سپر، کندھے پر کمان زین پر گرز گاؤسر دھرا، کمند ابریشمی شکار بند میں آویزاں علم کے سائے میں نیزہ تانے کھڑا تھا اور عربی گھوڑا جس پر پوست پلنگ کی پاکھر پڑی تھی، رانوں میں سے نکلا جاتا تھا۔

ادھر حریف کے لشکر میں پہلے ہاتھیوں کی قطار بعد اس کے رتھیں اور بہلیاں اور پیادہ اور سوار فوج تھی کہ جس کا شمار سوائے منشی تقدیر کے کسی کو معلوم نہیں۔ ہاں سلسلہ انتظام اس کا خاص ایک شخص کی چٹکی میں تھا کہ جدھر چاہے ادھر موڑ دے۔ بیچوں بیچ میں ہند کا سیناپتی مگر سر سے پاؤں تک اونچی بنا ہوا زرد گلے پر کرتہ اور اس پر زرہ بکتر چار آئینہ سجائے، راجپوتی ایک مچھ بھوں پر رکھے کمر میں ایک طرف سروہی کی تلوار، دوسری طرف کھانڈا اور کٹار، پشت پر گینڈے کی ڈھال، سورج مکھی کے سائے میں ہاتھی پر بیٹھا، دونوں لشکروں کو نظر غور سے دیکھ رہا تھا۔

آخر نہ رہ سکا اور تڑپ کر ہاتھی سے کود گھوڑے پر سوار ہوا، بھائی کو ہاتھی پر بٹھا دیا، آپ دکھنی گھوڑی اڑاتا، سپہ گری کا بانکپن دکھاتا، بھالے کے ہاتھ نکالتا، دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں تک ایک چکر لگایا اور پھر لشکر کے سامنے کھڑے ہو کر اہل لشکر کے دلوں کو اس طرح بڑھایا:

''اے راجپوتوں کے سپوتو! پہاڑوں کے افغان اور تاتار کے ترکوں کا سامنا ہے۔ ملیچھ مسلمان ہیں جو دھرم کے بھرشٹ کرنے پر کمریں باندھ باندھ کر آئے

ہیں۔ ابھی تمہاری سرحد پر کھڑے ہیں۔ اگر ہمت کرو تو کچھ محال نہیں۔ خرگوشوں کی طرح جھاڑیوں میں بھگا بھگا کر مار لو گے اور اگر ایک قدم تمہارا ہٹا تو پاؤں ان کے ہمارے تمہارے گھروں میں اور ہاتھ ننگ و ناموس میں ہوں گے۔ آج دھرم گیان کی لاج تماری تلوار کی باڑ پر ہے۔ مارو...... مارو...... دم نہ لو اور جانے نہ دو......"

راجہ ابھی یہ تقریر تمام نہ کر چکا تھا کہ اتنے میں لشکر شاہی کے بائیں ہاتھ پر جو افغان براجمائے کھڑے تھے' آگے بڑھے اور خلجیوں نے بھی باگیں لیں۔

انہیں دیکھ کر راجپوت بہادروں کے سپوت جن کی تلواریں میانوں میں مچھلی کی طرح تڑپی جاتی تھیں ہاتھیوں کی صف کو چیر کر نکل آئے' تیر برساتے ہوئے دوڑے اور ایک دم ہی برچھیوں پر لے لیا۔ جب یہ حال دیکھا تو افغان پیچھے ہٹے اور خلجیوں کے پرے نے بھو گھونگھٹ کھایا مگر سپہ دار بے سپاہ قلب میں' اسی طرح جما ہوا تیر مارے جاتا تھا جو ایک مصاحب نے آ کر عرض کیا:

''افغان اور خلجیوں نے پیٹھ دکھائی' جن نمک خواروں' سرداروں سے پسینےکی جگہ خون گرانے کی امید تھی' وہ جان بچا کر بھاگ گئے۔ دشمن چڑھا چلا آتا ہے۔ حضور اب کس کی راہ دیکھتے ہیں۔ برائے خدا گھوڑے کی باگ پھیر دیجئے۔ اب لاہور میں پہنچ کے بداندیشوں کا بندوبست قرار واقعی ہو جائے گا''۔

یہ سنتے ہی بادشاہ شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔ رہی سہی فوج کو سمیٹ کر للکارا اور گھوڑے کو ڈپٹا کر برق کی طرح دشمن پر جا پڑا۔ نیزہ اور شمشیر سے گذر کر فقط خنجر اور کٹار پر نوبت آ گئی۔ اتنے میں کھانڈے راؤ کی نظر بادشاہ پر پڑی۔ فیلبان کو

آواز دی کہ خبردار جانے نہ پائے۔

اس نے ہاتھی کو ریلا۔ شہاب الدین بھی جھک کر اس طرح جھپٹا کہ گھوڑے کے دونوں ہاتھ ہاتھی کی کستک پر بیٹھے اور ہاتھی کے منہ میں ایسا نیزہ مارا کہ دانت اس کے ٹوٹ گئے مگر خود بھی زخم کاری کھایا۔ ڈگمگا کر گھوڑے سے گرا چاہتا تھا کہ ایک غلام لگا پکڑ کر نظروں سے غائب ہو گیا۔

غرضیکہ بھاگے بھٹکے سپاہی اور ٹوٹا پھوٹا لشکر پھر لاہور میں آیا اور یہاں ملک کا بندوبست کر کے غزنی کو روانہ ہو گیا۔ اس لڑائی میں تماشہ یہ ہوا کہ جن سرداروں کو بہادری اور جاں نثاری کے بڑے بڑے دعوے تھے اور بادشاہ کو بھی ان پر بھروسہ تھا وہی میدان جنگ سے بھاگے تھے۔ چنانچہ غزنی میں پہنچ کے علماء سے فتویٰ طلب کیا کہ جو مسلمان جہاد سے بھاگے اس کے لئے کیا حکم ہے۔

سب نے لکھا کہ وہ گنہگار خدا ہے۔ بادشاہ نے حکم شرعی ہاتھ میں لیا اور تمام سرداروں کو گرفتار کیا جو اور چنے گھوڑوں کے توبڑوں میں ڈال کر انہیں چڑھوا دیئے اور بازاروں میں چھوڑ دیا کہ خاص و عام عبرت پکڑیں اور جو نہ کھائے اس کا سر الگ۔ پر یہ سزا تو معاف ہوئی مگر دربار سے بند ہو گئے۔

دوسرے برس سال نوروزی نے پلٹا کھایا۔ بادشاہ نے اندر ہی اندر سب انتظام کر رکھے تھے۔ فہرست منگوا کر دیکھی اور فوج کے ہر محکمہ کو کوچ کا حکم بھیج دیا۔ پھر آٹھ دن بعد خود سفر پر روانہ ہوا۔ اس وقت بادشاہ کے ساتھ غوری خاندان کا ایک سردار تھا۔ اس نے بادشاہ سے عرض کیا:

"اعلیٰ حضرت! سامان تو کسی بڑی مہم کا دکھائی دیتا ہے مگر اس کا راز نہیں کھلتا

کہ یہ لشکر کس سمت روانہ ہوگا؟"

شاہ نے افسردگی سے اس سردار کو اپنا بند قبا کھول کے دکھایا اور آہ سرد کھینچ کر بولا:

"اے مرد بزرگ! کیا تو گذشتہ سال کی شکست بھول گیا۔ یہ داغ اس شکست کے ہیں۔ اس وقت سے میں نے نہ تو لباس تبدیل کیا ہے اور نہ بیگم کے پاس سویا ہوں۔ وہ صدمہ دن رات پیش نظر رہتا ہے۔ خدا نے چاہا تو کفار سے اس کا بدلہ لے کے رہوں گا۔"

مرد بزرگ نے دعائے خیر کی اور مشورہ دیا:

"اے شاہ ذی قدر!.....اگر دشمن سے بدلہ لینے اور عزت بلند و بالا کرنے کا ارادہ ہے تو مصلحت یہ ہے کہ وہ تمام سردار جن پر عتاب نازل ہوا ہے اور نہیں دربار بدر کر دیا گیا ہے انہیں مصلحت وقت کے تحت معاف کیا جائے بلکہ انہیں دربار میں بلا کر ان کے عہدے بلند کئے جائیں اور ان کی ہمت افزائی کی جائے تا کہ وہ سر اٹھا چل سکیں اور شکست کا بدلہ لینے میں سر دھڑ کی بازی لگادیں۔"

مرد بزرگ کی بات بادشاہ کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے اس پر عمل پیرا ہونے کا پکا ارادہ کیا۔ چنانچہ جب لشکر ملتان پہنچا تو شاہ نے تمام سرداروں کو بلایا اور کہا۔

"اے مسلمانو! سال گذشتہ جو داغ دامن اسلام پر لگا تھا وہ آپ سب کو معلوم ہے۔ اس کا تدارک کرنا اور شکست کا بدلہ لینا ہر مسلمان پر فرض ہے۔"

سرداروں کے سر ندامت سے جھک گئے اور انہوں نے تلوار پر ہاتھ رکھ کر عرض کیا کہ شاہ کا کہنا درست ہے۔ہم خود شرمندہ ہیں اور انشاء اللہ اس کا بدلہ لے کر رہیں گے۔غرض جب لشکر لاہور پہنچا تو شاہ نے رکن الدین ایلچی کو ایک خط بلکہ ''اعلان جنگ'' کا نامہ لکھ کر مہاراجہ پرتھوی راج کو بھجوایا۔جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا:۔

''میں بمو جب حکم اپنے بھائی کے جو میرے باپ کی جگہ اور خراساں سے پنجاب تک مسلمانوں کا ق بادشاہ ہے'فوج لے کر اس طرف آیا ہوں۔ رائے پرتھوی راج کے راجگان ہندوستان میں مہاراجہ ہے۔ اسے لکھا جاتا ہے کہ اسلام کی اطاعت کر کے اتفاق کا طریقہ قائم کر لے تا کہ خلق خدا کی آسائش میں خلل نہ پڑے۔نہیں تو ملک خدا کا ہے۔تلوار دونوں کا فیصلہ کرے گی۔''

جب یہ خط پرتھوی راج کی نظر سے گزرا تو وہ سخت برافروختہ ہوا۔ادھر تو ایک جواب کہ پتھر اور لوہے سے بھی کڑا تھا لکھ کر روانہ کیا اور ادھر راجگان ہند کو جمع کر کے تین لاکھ راجپوتوں کا لشکر جن کی تلواروں سے خون ٹپکتا تھا ہمراہ لے کر چلا۔پہلی فتح کے بھروسہ پر بہت سے راجہ بہادرانہ رفاقت کا دم بھرتے مدد کو آئے۔ شہاب الدین غوری بھی ادھر سے آگے بڑھا اور دریائے سرسوتی کے کناروں پر دونوں لشکر ادھر ادھر بالمقابل ہوئے۔صرف دریا ان کے درمیان تھا۔

پرتھوی راج نے پہلے ایک خط اس مضمون کا سلطان غوری کو لکھا کہ:۔

حال اس لشکر بے شمار کا سپہ سالار اسلام کو معلوم ہوا ہو گا مگر اس کے علاوہ

بھی ہندوستان سے برابر فوجیں چلی آتی ہیں۔ ایک ایک راجپوت وہ منچلا بہادر ہے جس کی تلوار کی کابل اور قندھار تک پناہ نہیں۔ یہ چند نامراد ترک بچے اور افغان زادے جنہیں لوٹ کھسوٹ کا لالچ دے کر گھروں سے یہاں لایا ہے چاہئے کہ ان کی جوانیوں کو اور ان کے ماں باپ کے بڑھاپے پر رحم کر کے یہیں سے واپس ہو جا۔ ہمیں جان جوانمردی کی قسم ہے کہ پیچھا نہ کریں گے اور نہیں تو دیکھ لو کہ آتش بازی کے سامان بہت ہیں اور جنگی ہاتھی کچھ اوپر تین ہزار ہیں اگر اس تحریر پر خیال کیا تو بہتر ہے نہیں تو یاد رہے کہ ایک جاندار اس میدان سے جیتا نہ جائے گا۔"

شہاب الدین غوری نے اس موقعہ پر کچھ سوچا اور جواب میں لکھا:۔

راجہ نے جو نیک صلاح دی عین شفقت ہے مگر سب پر روشن ہے کہ اس لشکر کشی میں مجھے کچھ اختیار نہیں۔ بھائی کے حکم سے اس مہم کا بوجھ سر پر لیا ہے۔ جب تک وہاں سے حکم نہ آئے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اس قدر مہلت ہو کہ وہاں سے جواب آ جائے۔ اس وقت صلح اس عہد پر ہو جائے گی کہ ملک پنجاب سرہند تک ہمارے پاس رہے' باقی کل ہندوستان تمہارا۔

جب یہ کمزور جواب راجہ کے پاس پہنچا تو تمام اہل دربار ہنسنے لگے اور لشکر میں فتح کے شادیانے جیسے ساں اور حالات پیدا ہو گئے اور سب کو اطمینان اور سکول حاصل ہو گیا' بلکہ ڈیرے ناچ و رنگ شروع ہو گئے۔

دوسری طرف طرف سلطان شہاب الدین نے سر شام فوج کو کمر بندی کا حکم دے کر خیمے ڈیرے سب قائم رکھے اور راتوں رات کئی کوس کا چکر دے کر دریا پار اتر گیا۔ صبح کو جب راجہ کے لشکر میں ابھی کوئی بستر پر تھا تو کوئی نہانے گیا ہوا تھا کہ اسلامی لشکر دفعتاً دشمن کے پہلو میں آ گیا اور اس نے دمامہ جنگی پر چوٹ لگائی اور اس زور کا قرنی پھونکا کہ سوتے جاگتے سب اچھل پڑے۔ تمام فوج میں کھلبلی پڑ گئی۔ وہ لشکر بے شمار ایسا دریا تھا کہ ایک طرف کی ہل جل کی دوسری طرف خبر بھی نہ ہوتی تھی۔

مگر راجہ نے اس وقت ہوش و حواس درست رکھے۔ وہ ذرا نہ گھبرایا۔ ایک فوج تو تیار کر کے سامنے کی اور باقی انبوہ کو سمیٹ کر پھر میدان میں نہ جمایا۔

دوسری سمت اسلامی لشکر میں شہاب الدین غوری نے فوج کے چار حصے کر کے چار سپہ سالار کے چار سپہ سالار کے تحت قائم کر دیئے کہ باری باری جائیں اور اس لشکر کثیر کے مقابلے میں اپنی جانیں لڑائیں۔ مگر اس میدان میں راجپوت بھی اس خوبصورتی اور انتظام کے ساتھ مسلمانوں کے مقابل ہوئے کہ مسلمانوں کے دم اور جی چھوٹ چھوٹ گئے۔

اس وقت شہاب الدین نے جنگی چال چلی اور بظاہر لشکر کو پیچھے ہٹا کر یہ ظاہر کیا کہ خدانخواستہ اسے شکست ہو رہی ہے۔ راجپوتوں نے یہ دیکھا تو سمجھے کہ دشمن نے شکست کھائی مگر اس وقت سلطان غوری نے ایک تازہ دم لشکر کے ساتھ پلٹ کر ایک زبردست جوابی حملہ کیا مگر راجپوتوں کے لشکر کی اکثریت تھی اس لئے اس سے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ پھر جب ٹھیک دوپہر ہوئی تو پرتھوی راج ڈیڑھ سو

راجہ مہاراجوں کو ساتھ لے کر ایک درخت کے سائے میں آیا۔ سب نے تلواروں پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھائیں' پھر ایک ایک پیالہ شربت کا پیا' پان کا بیڑا منہ میں دبایا' تلسی کی پتی زبان پر رکھی اور کیسر کے ٹیکے پیشانیوں پر لگا کے غوری لشکر پر حملہ آور ہوا مگر شہاب الدین غوری اس وقت بارہ ہزار غلام خاص جن کے سروں پر فولادی خود جواہرات سے مرصع دھرے ہوئے تھے' انہیں لے کر اپنے لشکر سے جدا ہوا۔ اول غوری نے تاج شاہی اتارا اور کفن سر سے باندھا' پھر شمشیر اصفہانی کھینچی اور میان اس کی توڑ کے پھینک دی۔ غوری کے لشکریوں نے جب اپنے بادشاہ کو اس حال میں دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے خود الگ کر دیئے اور سروں سے کفن باندھ لئے' تلواریں کھینچیں اور داڑھیوں کو منہ میں دبا کر اس قدر شدید حملہ کیا کہ یا تو وہ ایک جگہ جمے کھڑے تھے یا پلک مارتے اور گھوڑے اڑاتے دشمن کے لشکر میں گھس گئے اور اس شدت کا حملہ کیا کہ دھواں دھار ہو گئے۔ پھر تو جو سردار ادھر ادھر لڑ رہے تھے وہ سب دائیں بائیں سے زور دے کر ایسے ٹوٹ کے حملہ آور ہوئے اور اس زور کا رن پڑا کہ دم کے دم میں ہزاروں کا قلع قمع ہو گیا۔

اگر چہ راجپوت تلواروں نے بہت زور مارا مگر انجام کار شکست کھائی۔ کھانڈے راؤ میدان جنگ میں بہادری کا حق ادا کر کے زندگی کے بوجھ سے آزاد ہو گیا۔

رائے پتھورا دریائے سرسوتی کے کنارے گرفتار ہو کر مارا گیا۔

تمام لشکر تتر بتر پریشان ہو گیا۔ سپاہی شام تک راجپوتوں کے خون سے ہاتھ رنگتے رہے۔

بادشاہ نے راتوں رات لاہور اورغزنی کو فتح کے پیغامات بھجوا دیئے۔
دوسرے دن لشکر کا انتظام کیا اور فوراً آگے روانہ ہوا۔ یہ لشکر اجمیر کو جو کہ راجہ کا صدر مقام تھا' روندتا ہوا دلی پہنچ گیا۔ چند گھکوجن کی قوم کی غارت گری کا بڑا شہرہ تھا۔ وہ رات کو خیمہ پھاڑ کے چپکے سے اندر گھس گئے اور انہوں نے بادشاہ کو مار ڈالا۔ یہ واقعہ تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز کا ہے یعنی بادشاہ 1206ء میں شہید ہوا۔
شاہ کو 1206ء میں دھوکے سے سوتے میں قتل کردیا گیا مگر قدرت کو ایک جلیل القدر مسلمان بادشاہ کی شہادت پسند نہ آئی اور اس نے انہی دنوں میں ایک دوسرے مسلمان بادشاہ کو سرزمین ہند پر قبضے کے لئے روانہ کر دیا۔ ترائن کی دوسری لڑائی کے بعد معز الدین نے مملکت ہند کا نظم ونسق اور اس کی توسیع کا کام بڑی حد تک قطب الدین ایبک کے حوال کردیا تھا یاد رہے کہ آج بھی انارکلی لاہور سے ایک سڑک نکلتی ہے۔ یہ سڑک مسلمانوں کو قطب الدین ایبک کے نام کی یاد دلاتی ہے اور ایبک روڈ کے نام سے پکاری جاتی ہے۔
پس 1194ء میں جب مسلمان بادشاہ کو دہلی کے باجگذار راجہ کی خفیہ تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو اس نے فوراً دہلی پر قبضہ کرلیا اور راجہ کو معہ فوج کے بحفاظت نکل جانے کی اجازت دی۔ یہ واقعہ 1194ءمیں ایبک نے کول (موجودہ علی گڑھ) فتح کرلیا' اس کے بعد قطب الدین اپنے آقا معز الدین کی فوج کی جو قنوج اور علی گڑھ کے بغاوتوں میں لگی تھی مدد میں لگ گیا۔ اب اجمیر کو پوری طرح سلطنت میں شامل کرلیا گیا اور وہاں مسلمان افسر مقرر کئے گئے۔
دوسری طرف پرتھوی راج کے لڑکے کو رتھمبور کا حاکم بنا کر بھیج دیا گیا'

1196ء میں چالوکیہ کی مدد سے چاہانوں نے پھر اجمیر پر حملہ کر دیا۔ ایبک اجمیر پہنچا تو خود وہاں محصور ہو گیا لیکن غزنی سے بروقت کمک پہنچنے پر محاصرہ ٹوٹ گیا۔ 1197ء کے آغاز میں ایبک نے کوہ آبو کے پاس چالوکیہ کی فوج کو شکست دی اور آگے بڑھ کر ان کی راجدھانی انہل واڑا کو تاراج کیا لیکن یہ جگہ دہلی سے اتنی دور تھی کہ اس پر مستقل قبضہ نہ ہو سکا۔

1197-99ء کے دوران بدایوں' بنارس اور قنوج پر قبضہ ہو گیا۔ بنارس ابتدائی فتح کے بعد ہاتھ سے نکل گیا تھا وہ اب دوبارہ فتح ہوا۔ قنوج کی ریاست پہلے ہی فتح ہو چکی تھی۔ اب خاص شہر پر قبضہ ہو گیا۔ 1202-10ء میں چندیلوں کی راجدھانی کالنجر فتح ہو گئی۔

سلطنت کی تشکیل:۔

معز الدین کے انتقال کے وقت شمالی ہند کے حالات اطمینان بخش نہ تھے۔ یوں تو سارا شمالی ہند فتح ہو چکا تھا لیکن مفتوحہ علاقوں کو ابھی استقامت حاصل نہ ہوئی تھی۔ معز الدین کی وسط ایشیا کی شکست اور پھر اس کی موت سے ہندوؤں کو سر اٹھانے کا موقعہ ملا۔ کالنجر' بدایوں' فرخ آباد' گوالیار اور لکھنوتی میں ہندوؤں نے بغاوت کر دی۔ ہندوؤں کی قوت جو ترک فاتحوں کے تیز رو ریلوں سے دب گئی تھی' اب موقع پا کر ہر طرف ابھرنے لگی۔ ادھر گورنروں نے خودسری کا رویہ اختیار کیا۔ حکومت دہلی کی جمعیت بکھرتی نظر آتی تھی۔

معز الدین کے ترک افسروں میں قطب الدین ایبک' ناصر الدین قباچہ اور

تاج الدین بلدوز نمایاں امتیاز کے مالک تھے۔ قطب الدین کی حیثیت ہندوستان میں حاکم اعلیٰ کی تھی اور اسے دوسرے ترک امراء پر اولیت حاصل تھی۔ اگر چہ بعض ترک امیر اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

معز الدین کے انتقال کے بعد وہ اہالیان لاہور کی دعوت پر دہلی سے لاہور آیا اور جون 1206ء میں مملکت ہند کی سلطنت پر قبضہ کیا۔ ایبک کی اور اس کی ساتھ خود حکومت ہند کی قانونی حیثیت ابھی واضح نہ تھی۔ وہ اب بھی غلام تھا۔ معز الدین کے جانشیں سلطان غیاث الدین محمود نے غور سے چتر شاہی بھیجا اور سلطان کا لقب اختیار کیا۔ 1208ء میں ایبک کو قید غلامی سے آزاد بھی کر دیا گیا۔

سلطان ایبک کی مشکلات:۔

ہر چند کہ سلطنت وجود میں آ چکی تھی لیکن ابھی تک غزنی اور غور کے اس کا تعلق باقی تھا اور یہ تعلق خطرہ سے خالی نہ تھا۔ وسطی ایشیا میں خوارزم شاہی زور پکڑتے جا رہے تھے۔ غور یا غزنی پر جو بھی قابض ہو جاتا وہ سلطنت دہلی پر بھی تصرف کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

یکروز نے غزنی پر قبضہ کر کے دہلی پر اپنا حق جتایا۔ لیکن اسے بھی خوارزم شاہی دباؤ اور اندرونی بغاوت (مخالفت) کے باعث غزنی چھوڑنا پڑا۔

خوارزم شاہ ایبک کے لئے بڑے خطرے کی صورت تھی۔ اگر خوارزم شاہی غزنی پر قابض ہو جاتے تو دہلی کو اور بھی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس لئے ایبک نے غزنی کے خالی تخت پر خود ہی قبضہ کر لیا۔ لیکن چالیس دن کے اندر ہی اندر بلدوز

فوج لے کر بڑھا تو ایک کو غزنی چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ سندھ میں یلدوز کا داماد قباچہ خودمختاری کا دم بھر رہا تھا۔ بنگال میں بختیار کی موت کے بعد سے برابر ردو بدل ہو رہا تھا۔ بختیار کے قاتل علی مردان کو خلجی امراء نے ٦ گرفتار کرلیا۔ علی مردان کسی طرح قید سے بھاگ کر دہلی آیا اور قطب الدین سے اجازت لے کر پھر لکھنوئی پر قابض ہو گیا۔ بنگال کے ان تغیرات میں حکومت دہلی کو بہت کم عمل و دخل رہا۔ حکومت دہلی اس وقت بقائے وجود کے لئے کشمکش کر رہی تھی۔ شمال مغربی سرحد پر خطرہ اتنا قریب تھا کہ قطب الدین کو مسلسل لاہور رہنا پڑا اور وہیں 1210ء میں چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ایسا زخمی ہوا کہ جانبر نہ ہوسکا۔

قطب الدین ایک بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ ہندوستان کی بیشتر فتوحات اس کے ہاتھ سے اس کی سرپرستی میں سرانجام پائیں۔ وہ بڑا ہوشیار اور مستعد فوجی رہنما تھا۔ اپنی چار سالہ حکومت میں اس نے سلطنت دہلی کو بیرونی آفات سے بچانے کی پوری کوشش کی۔ اس کے وقت کا بیشتر حصہ فوجی مہمات اور ملکی معاملات میں صرف ہوتا تھا۔ پھر وہ شعر و ادب کی چاشنی سے بھی آشنا تھا۔ وہ جب انعام دینے پر آتا تو ہزاروں لاکھوں کی نوبت آجاتی تھی اس لئے وہ ''لکھ بخش'' کے لقب مشہور تھا۔

ابتدائی زندگی:۔

التمش البری قبیلہ کا ترک تھا۔ لڑکپن میں اس کے قبیلے کے کچھ لوگ اسے بردہ فروش کے ہاتھ بیچ آئے۔ غلامی کے راستے سے التمش صدر جہاں بخارا کے گھر پہنچا

اسے جمال الدین چست قباغزنی لے آیا۔ بالآخر قطب الدین ایبک نے اسے خرید لیا۔ پہلے اسے امیر شکار کا عہدہ دیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ گوالیا اور پھر بدایوں کا گورنر مقرر رہوا۔

شمس الدین التمش:۔ 1120-1136ء

قطب الدین کی وفات پر لاہور کے امرا نے اس کے بیٹے آرام شاہ کو تخت پر بٹھایا لیکن نہ تو باپ جیسی لیاقت تھی اور نہ اس جیسا عزم ایسے مشکل حالات میں جبکہ سلطنت اندرونی خلفشار کا شکار تھی دہلی کے امرا نے بدایوں کے گورنر التمش کو تخت وتاج قبول کرنے کی دعوت دی کا شکار تھی۔ التمش نے دہلی آکر عنان حکومت سنبھالی اور قطب الدین کی ایک بیٹی سے شادی کر لی۔

دہلی اب سلطنت کا صدر مقام قرار پایا۔

التمش کی مشکلات

بنگال میں علی مردان نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ قباچہ نے کہرام سرحد اور لاہور وغیرہ پر قبضہ جمالیا۔ رتھمبور نے بھی بغاوت کردی۔ بلدوز نے ایک ہی چال چلی۔ اس نے التمش کو چتر و دور باش بھیج کر یہ بتایا کہ وہ اب بھی دولت غزنی کا تابعدار ہے۔ بلدوز کی طرف سے ہند پر حکومت کرنے کی اجازت ماننا التمش کی توہین تھی لیکن ابھی اس کے قدم جمے نہ تھے اس لئے اسے بلدوز کا اجازت نامہ قبول کرنا پڑا۔ ادھر غزنی سے تعلق رکھنے میں بڑا خطرہ یہ تھا کہ غزنی پر خوارزم شاہ کی

نظر تھی اور خود خوارزم پر منگول حاوی ہوتے جا رہے تھے۔

خطرات ہی خطرات:۔

خوارزم شاہ کو غزنی سے بے دخل کیا گیا تو اس نے لاہور پہنچ کے قباچہ کے افسروں کو نکال باہر کیا اور پنجاب پر قابض ہو گیا۔ بلدوز کی اس پیش قدمی سے بیرونی خطرات اور بڑھ گئے۔ اس لئے التمش فوج لے کر آگے بڑھا اور ترائن کے میدان میں اس نے 1215ء میں بلدوز کو شکست دے کر اسے گرفتار کرلیا پھر کچھ دنوں بعد ہی قباچہ نے لاہور پر قبضہ کرلیا۔ ہر چند کے 1217ء میں التمش نے قباچہ کو لاہور سے نکال کر وہاں اپنے افسر مقرر کر دیئے لیکن پنجاب کا کچھ حصہ اب بھی قباچہ کے قبضہ میں تھا۔

ایک مصیبت یہ آئی کہ چنگیز خاں نے منگولوں کی لا تعداد فوج کے ساتھ خوارزم پر حملہ کر دیا۔ منگولوں کا یہ حملہ ایشیا کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ تھا اس سے ایشیا کے ایک بڑے حصے کی کایا پلٹ ہوگئی' اس حملہ سے اسلامی تہذیب وتمدن کو سخت نقصان پہنچا۔ کتابیں جلا دی گئیں اور عمارت مسمار کر دی گئیں۔ کاشغر سے بغداد تک ایک ''ہو'' کا عالم طاری ہو گیا۔ اس قیامت خیز طوفان کے کچھ جھونکے ہندوستان بھی پہنچے۔

خوارزم شاہی بکھری تو علاء الدین خوارزم شاہ نے بھاگ کر بحرۂ کیپسین کے ایک جزیرے میں پناہ لی۔ ایک کے ولی عہد نے منگولوں کے تعاقب سے پریشان ہو کر پنجاب کی راہ پکڑی۔ اس نے سیالکوٹ سے سندھ ساگر دوآب تک

کا علاقہ قبضے میں کر لیا لیکن یہاں بھی اسے منگولوں کا خطرہ تھا۔ اس لیے اس نے التمش سے دہلی آنے کی اجازت مانگی۔ التمش کو علم تھا کہ خوارزمی شہزادے کو بلانا منگولوں کو دعوت دینا تھا اس لئے اس نے فوراً جواب لکھ بھیجا کہ یہاں کی آب و ہوا آپ کے موافق نہ آئے گی اس لیے ادھر کا خیال چھوڑ دیں۔

ادھر منگول تعقب میں ملتا تک آ پہنچے تھے اور اسے سندھ اور مکران کے راستے سے ایران بھاگنا پڑا۔ یہ واقعہ 1224ء کا ہے۔

قباچہ کا خاتمہ:۔

یہ تو خیر ہوئی کہ منگول آئے اور چلے گئے۔ لیکن خوارزمی اور منگول فوج کی آمد و رفت سے قباچہ کو بہت نقصان پہنچا۔ پہلے تو خوارزمیوں نے اس سے بہت سا علاقہ چھین لیا پھر منگولوں نے ملتان کے محاصرے میں اس کی فوج کو بہت نقصان پہنچایا۔ جلال الدین کے بچے کھچے دستوں نے سیوستان میں بہت گڑ بڑ مچائی۔ التمش نے قباچہ کی پریشانیوں سے فائدہ اٹھایا اور سرسہ اور بھٹنڈہ پر قبضہ جما لیا، اگلے سال اس نے اچ پر فوج کشی کی۔ قباچہ کو شکست ہوئی اور اس نے دریائے سندھ میں کود کر خودکشی کر لی۔

اس طرح 1228ء میں سلطنت دہلی کی سرحد بحرۂ عرب تک پہنچ گئی۔

بنگال میں علی مردان کو اس کے افسروں نے قتل کر کے غیاث الدین ''عوض'' کو اس کی جگہ منتخب کیا مگر اس نے خودمختاری کا راستہ اختیار کیا۔ اور بہار پر قبضہ کر کے اسے بنگال میں شامل کر لیا۔ التمش نے اس کے خلاف فوج کشی کی۔

پہلے ''عوض'' کے استقبال کے لئے مقرر کیا۔محمود نے لکھنوتی پر قبضہ کرلیا اور عوض مارا گیا اس طرح 1226ء میں بنگال براہ راست دہلی کے ماتحت آ گیا۔

ڈیڑھ سال بعد محمود کا انتقال ہو گیا تو بنگال میں پھر شورش ہوئی۔ خلجی گروہ نے دہلی کے خلاف بغاوت کر دی اور التمش کو فوج کشی کرنا پڑی۔ اس نے بغاوت فرو کرنے کے بعد بنگال اور بہار کو دو الگ الگ صوبوں میں تقسیم کر دیا۔

ہندوؤں کی بغاوت:۔

معز الدین کے آخری ایام میں ہندوؤں کی بغاوت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ آسانی سے ختم نہ ہو سکا۔ معز الدین کے بعد ایبک کی وفات ہوئی تو ہندوؤں کو اور حوصلہ ہوا۔ ان کے راجاؤں کی سرکشی بڑھتی گئی۔ جو ہندو ریاستیں فتح ہوئی تھیں اور باغی ہو گئی تھیں التمش نے انہیں دوبارہ فتح کیا۔

التمش کے دور میں 1226ء سے 1225ء کے دوران دس سال میں جو ہندو ریاستیں دوبارہ فتح ہوئیں ان کا ذکر اس طرح ہے:۔

رنتھمبور'منڈور (کوہ شوالک) جالور'بیانہ'گوالیار'بدایوں' قنوج' بنارس'مالدہ اور کالنجر پر براہ راست قبضہ نہیں کیا گیا۔

گوالیار کے محاصرہ میں ایک سال لگا۔

مالدہ پر التمش نے خود فوج کشی کی۔

بھیلہ قلعہ اور شہر فتح ہو گیا۔ وہاں کے بڑے مندر سے بہت مال و دولت حاصل ہوئی۔

خلیفہ کا منشور:۔

1229ء میں بغداد کے خلیفہ کی طرف سے التمش کے نام تحائف اور برِ اعظم ہند میں حکومت کرنے کا منشور (اجازت نامہ) موصول ہوا۔ خلیفہ بغداد کا اپنا سیاسی اختیار بہت محدود تھا لیکن اسلامی دنیا خلیفہ کی اس وقت بھی بہت عزت کرتی تھی۔ خلیفہ کی اجازت کے بغیر کوئی حکومت قانونی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ اگر چہ خلیفہ کے حکم و اجازت کے بغیر کوئی حکومت قانونی حیثیت نہ رکھتی تھی اس لئے ایک اور التمش نے سلطنت دہلی کیلئے جس آزادی اور خود مختاری کی مسلسل کوشش کی تھی۔ اس کے نتیجے میں دہلی کی اپنی قانونی حیثیت غور اور غزنی کے تعلق سے یکسر آزاد ہو گئی۔ التمش کا انتقال 1236ء میں ہوا۔ اس کے ہونہار بیٹے ناصر الدین محمود نے حکومت سنبھالی مگر وہ جلد ہی بنگال میں فوت ہو گیا۔

باقی لڑکوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس نازک دور میں حکومت کا بوجھ سنبھال سکے۔ دوسرے لڑکے رکن الدین فیروز کو بدایوں پھر لاہور کی گورنری سپرد کی گئی لیکن یہ تجربہ بھی کامیاب نہ ہوا۔ اب التمش کی سب سے بڑی اولاد ''رضیہ'' تھی۔ رضیہ غیر معمولی قابلیت کی مالک تھی۔

رضیہ کی حکومت:۔

1231-32ء میں التمش گوالیار کی طویل مہم پر گیا تو اپنی غیر حاضری میں تمام ملکی معاملات رضیہ کو سونپ گیا۔ رضیہ نے اپنے گراں بار فرائض نہایت خوش

اسلوبی سے انجام دیئے۔ التمش واپس آیا تو بہت خوش ہوا اور اس نے رضیہ کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا اور چاندی کے سکے جاری کیئے جن پر اپنے نام کے ساتھ رضیہ کا نام بھی لکھا۔ بعض امراء نے اعتراض کیا کہ لڑکوں کے ہوتے ہوئے لڑکی کو کیوں ترجیح دی گئی۔ اس کے جواب میں سلطان التمش نے ارشاد فرمایا:

''میں نے یہ فیصلہ اس لیے کیا کہ میرے تمام لڑکے نا اہل ہیں۔''

اس معاملے اور سلسلے میں شاہی خاندان میں بڑی چپقلش چلی۔ فیروز کی والدہ ترکان (صفیہ کی سوتیلی ماں) اور اس کے دوسرے ہمنوا برابر اس کوشش میں لگے رہے کہ التمش اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ انہیں اگرچہ کسی حد تک کامیابی ضرور ہوئی اس لئے کہ 1235ء میں التمش لاہور سے فیروز کو اپنے ساتھ دہلی لے آیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ کسی تبدیلی کا اعلان کر سکے۔ اس کا انتقال ہو گیا۔

اس معاملہ کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ نہ اس زمانہ میں اور نہ اس کے بعد کسی نے رضیہ کے انتخاب پر شرعی حیثیت سے اعتراض کیا۔ سب سے پہلے اس معاملہ پر مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے شرعی حیثیت سے روشنی ڈالی۔

(دیکھئے مضمون ڈاکٹر حبیب اللہ' انڈین ہسٹاریکل کوارٹرلی 1940ء)

رکن الدین فیروز شاہ:۔

اہلیان دہلی رضیہ کے ہمنوا تھے۔ لیکن شاہ ترکان یعنی رضیہ کی سوتیلی ماں اور

چند فوجی افسروں نے مل کر رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھا دیا۔ تاج اور تخت کی بھاری ذمہ داری بھی رکن الدین کو سلامت روی کا رستہ نہ دکھا سکی اور اس کی عیش پرستی نے بہت جلد اس کے ہمنواؤں کو اس سے بیزار کر دیا۔ شاہ تر کان کا اقتدار بڑھ گیا اور وہ رضیہ کے درپے ءآزار ہوا۔ وہی فوجی افسر جنہوں نے رکن الدین کو تخت پر بٹھایا تھا اب وہی سب اس کے خلاف ہو گئے اور رکن الدین کو تخت سے اتارنے کے لئے صوبوں میں جمع ہونے لگے۔

فیروز انہیں منتشر کرنے کے لئے کہرام کی طرف بڑھا۔ لیکن خود اس کے افسروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ دہلی لوٹ کر آیا تو نقشہ ہی بدل چکا تھا۔

سلطانہ رضیہ

فیروز جب کہرام روانہ ہوا تو شاہ تر کان نے رضیہ کو راستے سے ہٹانا چاہا۔ رضیہ نے سرخ لباس پہن کر قلعہ کے ایک جھروکے سے لوگوں سے فریاد کی:

''مسلمانو! مجھے ان ظالموں سے بچاؤ۔''

وہ جمعہ کا دن تھا۔ لوگوں کا بڑا اجتماع تھا۔ فیروز اور شاہ تر کان کی ٹولی سے لوگ پہلے ہی بیزار تھے۔ رضیہ کے اس غیر معمولی مظاہر کا لوگوں پر کافی اور فوری اثر ہوا۔

شاہ تر کان کو حراست میں لے لیا گیا۔

فیروز واپس آیا تو وہ بھی گرفتار کر لیا گیا۔

اہالیان دہلی نے مل کر رضیہ کو تخت پر بٹھایا۔

یہ جمعہ نومبر 1236 تھا۔

عصاص نے فتوح السلاطین میں لکھا ہے کہ تخت نشینی کی رسم میں تخت اور اہل دربار کے درمیان سرف ایک پردہ حائل تھا۔

وہ فوجی افسر جنہوں نے فیروز کے خلاف علم بلند کیا تھا وہ رضیہ کے انتخاب سے بھی خوش نہ ہوئے کیونکہ ان کا ارادہ یہ تھا کہ خود دہلی پہنچ کے فیروز کا کوئی ایسا جانشین چنیں جوان کی مرضی کے مطابق کام کرے۔

رضیہ سلطانہ کے انتخاب سے منجملہ اور باتوں کے ایک اہم نکتہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہالیاں عہلی نے ''التمش'' کا انتخاب کیا تھا۔ فیروز کو صوبائی فوجی افسروں نے تخت پر بٹھایا تھا۔ رضیہ کے معاملہ میں دہلی والوں نے اپنا حق انتخاب پھر منوالیا۔ اس انتخاب نے فوجی افسروں نے بنائے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ اس لئے اب وہ اپنا حق شاہ گری منوانے کے لئے دہلی کے باہر جمع ہونے لگے۔

دہلی والوں نے رضیہ کا ساتھ دیا۔ رضیہ کی فوجی طاقت اس وقت اچھی نہ تھی لیکن اس نے بڑی ہوشیاری سے کام کیا۔ اس نے باغی افسروں میں سے ایک دو کو اپنے ساتھ ملالیا اور پھر اس بات کا زور شور سے اعلان کیا کہ دوسرے افسر پریشان ہو گئے اور ان میں ایک دوسرے پر اعتماد نہ رہا۔ ان کی آپس کی رقابتیں بھڑک اٹھیں اور ان کی جمعیت جلدی منتشر ہوگئی۔

اس بغاوت کے فرو ہوتے ہی رضیہ کا اقتدار قائم ہو گیا اور لکھنوتی سے دہلی تک سب گورنروں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ لیکن اب بغاوتوں کا ایک نیا سلسلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ رضیہ کے عہد میں راجپوتوں کی سرکشی کا ایک نیا سلسلہ شروع

ہوتا ہے۔ چوہانوں نے قلعہ رتھمبور کو گھیر لیا۔ مسلم فوج کو قلعہ چھوڑ کر آنا پڑا۔ چوہانوں نے شمال مشرقی راجپوتانہ مسلمانوں سے خالی کرالیا اور میواتیوں کو ساتھ ملا کر دہلی کی حدود میں بھی چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ گوالیار کا مضبوط قلعہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔

دوسری طرف لاہور کے گورنر کبیر نے علم بغاوت بلند کیا۔ ملک کبیر کا خیال تھا کہ رضیہ عورت ہے اور وہ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکے گی لیکن رضیہ فوراً فوج لے کر لاہور پہنچی۔ ملک کبیر سرحد کی طرف بھاگا۔ وہاں منگولوں نے اسے چین نہ لینے دیا۔ بالآخر زچ ہو کر وہ لاہور آیا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ رضیہ نے اسے معاف کر کے گورنری پر بحال کر دیا۔

رضیہ نے منگولوں سے صلح و آشتی کے تعلقات برقرار رکھے۔ جب منگولوں نے سابق خوارزمی افسر حسن کو گورنری سے نکالا تو رضیہ نے اسے کسی قسم کی مدد دینے سے انکار کر دیا۔ منگولوں نے بھی یہ لحاظ رکھا کہ رضیہ کے عہد میں پنجاب پر کوئی حملہ نہ کیا۔ اس زمانہ میں سلطنت اور منگولوں کے درمیان دریائے چناب سرحد تھا۔ رضیہ کے بعد ہی منگولوں نے چناب کے پار حملے شروع کر دیئے اور لاہور کو کئی بار تاراج کیا۔

رضیہ سلطانہ معمولی عورت نہ تھی۔ وہ ایک غیر معمولی شخصیت کی مالک تھی۔ لیاقت کے ساتھ ساتھ اس کا حوصلہ بھی بہت بلند تھا۔ وہ امرا کے سہارے حکومت کرنا چاہتی تھی اور نہ اس کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ دوسروں کے ہاتھوں میں کھلونا بنی رہے۔ وہ حکومت کے تمام اختیارات براہ راست اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی تھی۔ وہ

سمجھتی تھی کہ پردہ کی پابندیاں اس کی راہ میں حائل ہیں۔ پس اس نے زنانہ لباس ترک کر دیا اور پردے سے باہر آ گئی۔ قبا اور کلاہ پہن کر وہ خلق کے سامنے آتی۔ جب وہ ہاتھی پر سوار ہوتی تو ہر شخص اسے دیکھ سکتا تھا۔

اسی زمانہ میں اس نے جلال الدین یاقوت نامی غلام پر کچھ خصوصی عنایات کیں۔ ڈاکٹر حبیب اللہ نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس امتیازی سلوک کی نوعیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ رضیہ نے اپنا اقتدار بڑھانے کی غرض سے ایک غیر ترک کو ترکوں پر فائق کیا۔ ترک افسروں نے حکومت کو اچھا خاصا اپنا پابند بنا رکھا تھا۔ اس اجارہ داری کو توڑنے کی یہی صورت تھی کہ غیر ترکوں کو آگے لایا جائے۔ رضیہ سلطانہ نے یاقوت (غلام) کو امیر آخور کا عہدہ دیا اور اسے اپنا مشیر خاص بنایا۔

امرا اسے کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ انہیں یہ بات نہایت ناگوار گزری۔ انہوں نے خفیہ طور پر رضیہ کی مخالفت شروع کر دی۔ امیر تبگین جو رضیہ کی حکومت میں امیر حاجب کے اہم عہدے پر فائز تھا' اس مخالفت میں پیش پیش تھا لیکن امرا جانتے تھے کہ دہلی میں رضیہ کی حیثیت بہت مضبوط ہے اس لئے انہوں نے اتبگین کے اشارے پر بھٹنڈہ کے گورنر **ملک** التونیہ سے **علم** بغاوت بلند کرایا اس اقدام کے دو مقاصد تھے۔ اول رضیہ کو دہلی سے ہٹانا جہاں اسے عوام کی حمایت حاصل تھی دوسرے دہلی کو سلطانی سپاہ سے خالی کرانا تھا تا کہ وہاں آسانی سے انقلاب لایا جا سکے۔

التونیہ کی بغاوت سے یہ دونوں مقصد پورے ہو گئے۔ رمضان کا مہینہ تھا اور

گرمیوں کا زمانہ لیکن رضیہ فوراً فوج لے کر روانہ ہو گئی۔ بھٹنڈہ پہنچ کے ترک افسروں نے یاقوت کو قتل کر دیا اور رضیہ کو گرفتار کر کے ملک التونیہ کی سپردگی میں دیدیا۔

معز الدین بہرام شاہ کی حکومت :۔

دہلی میں اتگین کی بن آئی۔ رضیہ کی گرفتاری کی خبر پہنچتے ہی ترامرا نے التمش کے تیسرے بیٹے بہرام شاہ کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ لیکن شرط یہ تھی کہ اتگین نائب مملکت ہو۔ امرا نے جب بیعت کی تو اس میں بھی یہ شرط شامل تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملوک اور امرا رضیہ کا تجربہ دہرانا نہیں چاہتے تھے۔ اتگین نے تمام امور اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ یہاں تک کے سلطنت کے وزیر مہذب الدین کی بھی اس کے آگے نہ چلتی تھی۔ اس نے بہرام کی بہن سے شادی کر لی اور شاہانہ انداز اختیار کئے۔ بہرام کو ان باتوں پر سخت طیش آیا اور اس نے اپنی تخت نشینی کے تین ماہ بعد ہی اتگین کو قتل کرا دیا۔

اس ردو بدل میں التونیہ کو کچھ نہ حاصل ہوا اگر چہ رضیہ کے خلاف ہنگامہ برپا کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ اتگین کے قتل سے رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔ اس لئے ملک التونیہ نے رضیہ سے شادی رچالی اور دونوں نے ایک بار پھر تخت دہلی کے لئے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے کھوکھروں اور جاٹوں کی ایک فوج لے کر دہلی پر یورش کی لیکن دہلی آزمودہ کار سپاہ کے آگے وہ کچھ نہ کر سکے اور ایک ہی جوابی حملے میں بھاگ کھڑے ہوئے۔

رضیہ اور ملک التونیہ بھٹنڈہ کی طرف واپس ہوئے۔ راستہ میں ان کی فوج نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر کیتھل کے قریب ڈاکوؤں نے انہیں پکڑ کر مار ڈالا۔ یہ اکتوبر 1240ء کا زمانہ تھا۔ رضیہ کا انجام بہت برا ہوا جس کی وہ سزاوار نہ تھی۔ پاک و ہند میں رضیہ ہند کی پہلی ملکہ تھی۔ وہ بڑی ہوشمند اور مدبر تھی۔ اسے اپنی رعایا کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ رضیہ علم و ادب سے بھی دلچسپی رکھتی تھی بدقسمتی سے وہ ایسے زمانہ میں برسر اقتدار آئی جب عورت کا حکمران ہونا بڑی غیر معمولی بات معلوم ہوتا تھا۔ رضیہ کی صنف (عورت ہونے) نے اس کی خوبیوں کو بروئے کار نہیں آنے دیا۔

امرا کی مخالفت:۔

بہرام نے اتگین کے قتل کے بعد کوئی نائب مقرر نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اس کے امیر حاجب بدرالدین سنقر نے بڑا اقتدار حاصل کیا۔ یہاں تک کہ وہ بادشاہ اور وزیر کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ سنقر نے دہلی کے بعض امرا کو ملا کر بہرام کو تخت سے اتارنے کی سازش کی۔ وزیر مہذب الدین بظاہر سنقر کا طرفدار تھا لیکن اس نے بہرام کو سازش سے آگاہ کر دیا۔ بہرام نے سنقر کو برطرف کر کے بدایوں جلاوطن کر دیا۔ سنقر بغیر شاہی اجازت کے دہلی واپس آ گیا تو بہرام نے اسے فوراً قتل کرا دیا۔ اتگین اور سنقر کے یکے بعد دیگرے قتل سے وہ تمام امرا جو بہرام کو تخت پر بٹھانے کی ذمہ دار تھے وہ تمام کے تمام اس کے خلاف ہو گئے۔

بہرام کی بدعنوانیوں سے علماء کرام بھی نالاں تھے۔ وزیر بھی ان کے ساتھ

خفیہ طور پر شامل ہو گیا۔ اس دوران ہی منگولوں نے لاہور پر یورش کی۔ لاہور کا گورنر اختیار الدین ان کا مقابلہ نہ کر سکا اور منگولوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔

دہلی سے مہذب الدین کے ساتھ فوج روانہ کی گئی۔ راستے میں مہذب الدین نے فوج کو ایسا ورغلایا کہ وہ لاہور جانے کے بجائے دہلی کو پلٹ گئی۔ بہرام نے شیخ الاسلام کو مفاہمت کے لئے بھیجا تو وہ بھی ان کے ساتھ جا ملے۔ فوج نے واپس آ کر دہلی کو گھر لیا۔ وزیر کے ساتھیوں نے شہر کے اندر بھی افراتفری مچا دی۔ فوج نے شہر پر قبضہ کر کے بہرام کو گرفتار کیا اور قتل کر دیا۔ یہ واقعہ مئی 1242ء کا ہے۔

سلطان کے جانشین اور وارث

جیسا کے پہلے بیان کیا گیا کہ سلطان محمود کی وفات پر اس کے بیٹوں میں جنگ تخت نشینی کا آغاز ہوا۔ جس میں بالآخر سلطان مسعود کو کامیابی ہوئی اور وہ غزہ کے تخت پر بیٹھا۔ سلطان مسعود غزنوی نے احمد نیال تگین کو لاہور کا حاکم مقرر کیا۔ نیال تگین نے 1024ء میں دریائے گنگا کے کنارے کنارے پیش قدمی کر کے بنارس پر کامیاب فوج کشی کی۔ مگر جب بعد میں اس کی سرکشی کی اطلاع ملی تو سلطان نے اپنے ہندو سالار تلک کو اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ تلک نے لاہور پہنچ کر باغیوں کو شکست دی۔ پھر سلطنا 1037ء میں خود برصغیر میں آیا اور ہانس کے مضبوط قلعہ کی فتح کیا۔ سلطان کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلجوقیوں نے غزنوی سلطنت پر حملہ کر دیا اور نیشاپور پر قبضہ کر لیا۔ سلطان مسعود پلٹ کر ان کے مقابلہ پر آیا۔ مگر ہندو آئے جن کی تعداد اس کی فوج کے نصف کے برابر بھی نہ تھی اس نے شکست کھا کر پیٹھ دکھائی ۔ وہ لاہور کی طرف بھاگا مگر اٹک اور راولپنڈی کے درمیان پہاڑیوں میں اس کی فوج نے شکست کھائی اور اسے قتل کر دیا گیا۔

محمود کے لڑکے مسعود نے 1042ء سے 1048ء تک حکومت کی ۔ اس نے دہلی کے راجہ پال کی حکومت کو ختم کرنے کی سر توڑ کوشش کی مگر مسلمانوں کی بہادری نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ لاہور میں آج بھی ''گنج شہیداں'' نامی ایک قبرستان ہے جس میں وہ مسلمان شہدا دفن ہیں جو اس موقعہ پر لڑتے ہوئے شہید

ہوئے تھے۔ سلطان مسعود کا بیٹا سلطان محمود 1048ء تک حکومت کرنے کے بعد شہید ہوا تھا۔

اب مسعود کے بیٹے سلطان ابراہیم نے تخت سنبھالا اور 1059ء سے 1099ء تک یعنی چالیس سال تک حکمرانی کی۔ اس نے سلجوقیوں سے صلح کر کے امن قائم کیا۔ اپنے دور حکومت میں اس نے پاک پتن کو فتح کیا تھا اور اس کے سردار ابوالنجم نے بنارس فتح کیا تھا۔

اب ابراہیم بن مسعود کا زمانہ آیا تو اس نے 1099ء سے 1115ء تک امن وسکون کے ساتھ حکومت کی پھر 1118ء میں سلاطین غور نے زور پکڑا اور 1151ء میں غزنی پر حملہ کر کے اسے نذر آتش کر دیا اور ان کے آخری دو بادشاہ خسرو شاہ اور خسرو ملک 1186ء تک لاہور میں مقیم رہے۔ سلطان محمد غوری نے آخری غزنوی سلطان خسرو ملک کو گرفتار کر کے خاندان غزنوی کا خاتمہ کر دیا اور اس طرح یہ عظیم اسلامی مملکت ختم ہوگئی۔

سلطنت غزنویہ کے آخری دور میں غزنی کا شہر مسلم ثقافت کا گہوارہ بن گیا تھا۔ یہاں ایک خانقاہ تھی جس کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ برصغیر کے مختلف گوشوں سے فضلاء اور طلباء کھنچے چلے آتے تھے۔ شہزادہ شہزاد جو شہر کا حاکم تھا اس نے یہاں ایک خانقاہ قائم کی تھی جس کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ مختلف گوشوں کے علاوہ وسط ایشیاء' ایران اور عراق سے بھی فضلاء اور طلباء کھنچے چلے آتے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں مختلف مدارس قائم تھے۔

لاہور کے شعراء میں پہلا نام مسعود راضی تھا جسے سلطان نے ناراض ہو کر

لاہور بھیج دیا تھا۔ بعد میں وہ جہلم اور ملتان کا حاکم بھی رہا۔ اس کا بیٹا ابو الفرج روائی اس عہد کا مشہور شاعر ہے۔ اس نے ایک دیوان بھی چھوڑا ہے۔ اس عہد کا عظیم ترین شاعر مسعود سعد سلمان تھا جو لاہور میں پیدا ہوا اور یہیں تعلیم پائی۔ اس نے اردو فارسی عربی اور ہندی میں شعر کہے ہیں۔ تاہم اس وقت اس کا محض فارسی دیوان موجود ہے۔ اس شاعر نے اپنی قید کے زمانہ میں جو اشعار کہے وہ زیادہ مقبول ہوئے۔

ایک صوفی مبلغ حضرت اسمعیل بخاری 1005ء میں لاہور آئے۔ آپ کا مزار ہال روڈ پر گرجے کے قریب موجود ہے۔ ایک اور بزرگ حضرت فخر الدین زنجانی بھی یہیں مقیم ہوئے اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ ان کی متعدد تصانیف میں "کشف المحجوب" بہت مشہور ہے۔ ان کا مزار چاہ میراں میں ہے۔ اس عہد میں حضرت بابا علی ہجویری (داتا گنج بخش) لاہور میں مقیم ہوئے اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ حضرت امام حسن الصنعانی 1181ء لاہور میں پیدا ہوئے اور یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر بغداد تشریف لے گئے۔

غزنی کی تباہی کے بعد شعرا اور فضلا نے لاہور میں پناہ لی اور اس شہر کی ثقافتی زندگی میں اضافہ کیا۔ آخری غزنوی تاجدار خسرو ملک کا دربار شعرا اور انتخاب قلم کا مامن و ملجا تھا۔

شہاب الدین غوری:۔

1160ء میں تخت غزنی کی امارت کے لئے غیاث الدین کا انتخاب

ہوا۔اس نے غزنی پر چڑھائی کی اور وہاں قبضہ کر کے غزنی کی امارت اپنے چھوٹے بھائی معز الدین کے سپرد کی۔ اس وقت معز الدین محمد غوری نے شہاب الدین کا لقب اختیار کیا۔ دونوں بھائیوں میں بے حد یگانیت اور محبت تھی۔محمد شہاب الدین غوری ہندوستان کے معاملات میں خود مختار تھا مگر ساری سلطنت کی خارجہ پالیسی غیاث الدین کے ہاتھ میں تھی۔بڑا بھائی فہم وفراست اور دوراندیشی میں لاثانی تھا اور چھوٹا بھائی بلند حوصلہ، شجاع اور اولوالعزم تھا۔

شہاب الدین کی یلغار:۔

غزنی کی امارت سنبھالتے ہی محمد غوری نے محمود کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا وسط ایشیا میں خوارزم شاہ کی مضبوط حکومت قائم تھی اس لئے محمد غوری نے برصغیر ہندو پاک کا رخ کیا اور اس نے وہاں ایک مضبوط حکومت قائم کی۔

جنگ کی ابتداء:۔

محمود کے بعد ملتان پر قرامطہ (اسمٰعیلی) دوبارہ غالب آ گئے تھے۔محمد غوری نے 1175ء میں حملہ کر کے ملتان پر قبضہ کر لیا۔اس کے بعد ''اچ'' کے اہم قلعہ کو بھی فتح کر لیا پھر تین سال بعد 1178ء میں وہ دوبارہ وارد ہوا۔

برصغیر پر حملوں سے محمود کا مقصد اشاعت اسلام نہیں تھا اگر چہ اس کے ساتھ مبلغین آئے اور اسلام کے لئے راستہ صاف ہوا لیکن محمود نے اسلام کے لئے ہندوستان میں کوئی مستقل ادارہ قائم نہیں کیا اور نہ ہی کسی ہندو کو تبدیلی مذہب کے

لئے مجبور کیا۔

حملے:۔

سبکتگین کی وفات کے بعد جے پال چاہتا تھا کہ اپنے کھوئے ہوئے علاقہ کو واپس لے۔ لہٰذا وہ جلدی ہی محمود سے الجھ پڑا۔ اس طرح 1001ء عیسوی میں محمود نے بعض سرحدی علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ مگر دوسرے اور تیسرے سال 1002/3ء جے پال کو پشاور اور دیہند پر شکستیں ہوئیں۔ ان شکستوں سے وہ اس قدر دل برداشتہ ہوا تو وہ خود چتا میں جل کے مرگیا۔

جے پال کے بعد آنند پال نے زمام حکومت سنبھالی۔ اس وقت محمود پنجاب سے گزر کر ملتان جارہا تھا۔ راستے میں اس نے آنند پال کو شکست دے کر ملتان کا محاصرہ کرلیا۔ ملتان کا حاکم ابوالفتح داؤد تھا۔ اس نے صلح کی درخواست کی اور عقائد سے توبہ کرنے کا وعدہ کیا لیکن ملتان پر قابض ہونے کے بعد اسمٰعیلی عقائد رکھنے والوں کو تہ تیغ کر دیا۔

جے پال کا ایک نواسے سکھ پال مسلمان ہو چکا تھا۔ اس کا نام نواسہ خاں یا نواسہ شاہ مشہور ہوگیا تھا۔ پس نواشہ شاہ نے ملتان اس کے حوالے کر دیا۔ محمود کی غیر حاضری میں سکھ پال نے پھر ہندو مذہب اختیار کرلیا اور باغی ہوگیا۔ محمود کو خبر ہوئی تو عین شدت کے جاڑوں میں روانہ ہوا اور سکھ پال کو شکست دی۔

ابوالفتح نے وعدہ پورا نہیں کیا تھا اور اپنے سابقہ عقائد پر قائم تھا پس محمود نے 1110ء یا 1111ء میں قلعہ پر حملہ کر کے قبضہ کرلیا اور ابوالفتح کو حبس دوام کی

سزادی اور ملتان کو سلطنت غزنوی میں شامل کرلیا گیا۔

بھٹنڈہ:۔

1014ءمیں تھانیشر میں ایک مقدس بت تھا جس کو ''چکر سوامی'' کہتے تھے۔تری لوچن پال نے پچاس ہاتھیوں کی پیشکش کی اور استدعا کی کہ تھانیشر سے درگذر کیا جائے' مگر محمود نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور راجہ کلو شکست دی اور محمود بت اٹھا کر غزنی لے گیا۔

تھانیشر:۔

1014ءمیں تھانیشر میں ایک مقدس بت تھا جس کو ''چکر سوامی'' کہتے تھے۔تری لوچن پال نے پچاس ہاتھیوں کی پیش کش کی اور استدعا کی کہ تھانیشر سے درگذر کیا جائے ،مگر محمود نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔اور راجہ کو شکست دی اور محمود بت اٹھا کر غزنی لے گیا۔

کشمیر:۔

محمود 1015ءکو کشمیر کے ارادے سے نکلا اور قلعہ کوہ کوٹ کا محاصرہ کرلیا مگر شدید سردی کی وجہ سے اسے واپس جانا پڑا۔یہ محمود کی پہلی ناکامی تھی۔

1018-19ءمیں پھر قلعہ کا محاصرہ کیا گیا۔دوآب دریائے گنگا اور جمنا کا درمیانی علاقہ ہے۔پس محمود کا یہ حملہ ایک طوفانی حملہ تھا بہت سے قلعے اور اہم

مقامات ایک ایک کر کے فتح ہوتے گئے جن میں زیادہ مشہور متھرا۔ بلند شہر اور قنوج ہیں۔ ہندو راجے محمود سے اس قدر مرعوب تھے کہ قنوج کا راجہ بغیر جنگ کے بھاگ گیا۔ راجہ قنوج کی اس بزدلی پر کالنجر کے راجہ نے اسے مطعون اور اس کے بیٹے تر لوچن پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔

گوالیار اور کالنجر

1022ء میں محمود نے گوالیار کا محاصرہ کیا تو راجہ نے ہاتھی تحفے میں بھیج کر صلح کر لی۔ پھر وہاں سے محمود کالنجر کی طرف روانہ ہوا اور محاسرہ کر لیا۔ راجہ نے تحفے میں تین سو ہاتھی بھیجے اور ہندی زبان میں قصیدہ لکھوایا پھر محمود نے محاصرہ اٹھالیا۔

سومناتھ:۔

1024ء میں سومناتھ کا مندر اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ یہ ایک مرکزی مرکز تھا جہاں شیو دیو یعنی چاند دیوتا کی عبادت ہوتی تھی۔ یہ مندر ایک مضبوط قلعہ بند جزیرے میں تھا صرف ایک پتلی سی پٹی اسے خشکی سے ملاتی تھی۔ اس پر ہی فصلیں بنائی گئی تھیں۔ مندر میں بے شمار مال و دولت تھی۔ وہاں کے محافظ بالکل بے دست و پا تھے۔ محمود بھی یہاں کا مال و دولت کا حال سن کر ہی آیا تھا۔ اب محمود نے سومناتھ پر چڑھائی کا ڈول ڈالا تھا۔ چونکہ یہاں چاند دیوتا کی عبادت ہوتی تھی اس لئے کہ وہاں سب سے زیادہ دولت تھی۔

سومناتھ پر حملہ

1925ء میں سومناتھ ایک مرکزی مندر تھا جہاں چاند دیوتا کی عبادت ہوتی تھی۔ یہ نہایت مقدس مندر تھا۔ اسکے اور خشکی کے درمیان صرف ایک پتلی سی خشکی کی پٹی تھی۔ مندر بنانے کیلئے قلعہ بند اور محفوظ جگہ تھی۔ محمود کے مشہور فتوحات سے یہ بات بھی مشہور ہوگئی کہ مندر میں بے حساب مال و دولت ہے۔ محمود کے مسلسل فتوحات سے یہ بات بھی مشہور ہوگئی تھی کہ سومناتھ کا دیوتا باقی دیوتاؤں سے ناراض ہوگیا تھا۔ محمود نے بھی سن کر اس پر چڑھائی کا ارادہ کیا تھا۔ محمود نے یہ سن کر پانی وغیرہ کا انتظام کیا اور جیسلمیر سے انہل واڑہ کے درمیان ہوگیا اور راس راستے سے جزیرے والے نہایت خاموشی سے کاٹھیاواڑ کے دارالسلطنت انہل واڑہ میں ایک دم سے نمودار ہوگئے۔ حیران پریشان پجاری گھبرا گئے۔ آخر انہوں نے زبردست مقابلہ کیا اور محافظ فوج نے ایسا زبردست حملہ کیا کہ راجہ ڈر کر بھگ گیا۔ اب محمود سومناتھ کے سامنے پہنچ گیا۔

راجہ کی فوج نے سومناتھ کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر قلعہ دو دن بعد فتح ہو گیا قلعہ سے بے شمار اور بے پناہ مال و زر و جواہر محمود کو وصول ہوئے۔ محصورین کا دل بیٹھ گیا اور وہ کشتی میں بیٹھ کے نکل بھاگا۔ دو دن بعد قلعہ فتح ہوگیا۔ محمود زمین دوز راستے سے مندر میں داخل ہوا اور اس نے فولادی گرز توڑ کے رکھ دیا۔

دو ہفتے تک خزانہ جمع کیا گیا پھر تمام جواہرات کے ساتھ محمود واپس چلا گیا۔

سومناتھ پر حملوں کے اثرات:۔

سلطان محمود بجلی جیسی تیزی سے ہندو پاک میں وارد ہوتا۔ اس کے آگے راجے مہاراجے بھاگ پڑتے تھے اور وہ مال دولت سمیٹتا واپس آتا۔

محمود نے اپنی طاقت کا صحیح استعمال کیا۔ ظالموں کو مار بھگایا۔ حاصل کردہ دولت کو سمیٹ کے خزانوں میں رکھ دیا۔ محمود نے آج تک اتنا مال دولت کبھی نہ دیکھا تھا اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

محمود بحیثیت فاتح :۔

محمود کا نام تاریخ کے عظیم فاتحوں میں شامل ہے۔ اس نے حکومت سنبھالی تو غزنی اور خراساں کا معمولی علاقہ اس کے پاس تھا۔ یہ حکومت بھی اس کی نہ تھی۔ وہ خودمختار سلطان بھی نہ تھا بلکہ اب بھی امیر ''سامانہ'' کا باجگذار تھا۔

وہ ایک فطری جرنیل تھا اور فن جنگ میں اسے کمال حاصل تھا۔ دوران جنگ وہ شکست کے موقعوں پر بھی اپنے حواس قائم رکھتا اور شکست کو فتح میں تبدیل کرنے کی جرأت رکھتا تھا۔

بحیثیت حکمران :۔

محمود بحیثیت ایک حکمران عظیم ہستی ہے۔ اس نے حکومت سنبھالی تو صرف غزنی اور خراساں کا مالک تھا۔ وہ ان کا مالک بھی نہ تھا مگر وہ آہستہ آہستہ مال (دیوان وزارت) کا نگران اعلیٰ بنا تھا۔ اس محکمہ میں زکوٰۃ، خراج اور تحائف کے علاوہ محصولات بھی تھے جو چین، ترکستان، ہندو پاکستان، عراق اور شام کے تجارتی

قافلوں سے وصول کئے جاتے تھے۔

سلاطین غزنہ

مرکزی حکومت کمزور پڑتے ہی صوبائی گورنروں نے خودمختار ہونا شروع کر دیا۔ دسویں صدی عیسوی میں خراساں اور بلخ پر سامانی خاندان حکومت کر رہا تھا۔ الپتگین، احمد بن اسمٰعیل کا سامانی غلام تھا۔ اس نے اپنی خداداد لیاقت کی وجہ سے ترقی کرنا شروع کر دی اور آخر خراساں کا گورنر بنا دیا گیا۔ الپتگین کے انتقال 961ء کے بعد الپتگین اور وزیر کے درمیان تخت و تاج کے مسئلہ پر اختلاف پیدا ہوگیا۔ پس سات سال کی عمر ہی میں سبکتگین کی غیر حاضری میں پایہ تخت کی نگرانی کا کام اس کے (محمود) سپرد کیا گیا۔ تمام بڑی جنگوں میں محمود نے باپ کے پہلو بہ پہلو حصہ لیا۔ سبکتگین کے عہد امارت میں اس نے نیشاپور کو فتح کر کے سلطنت غزنہ میں شامل کیا اور خراسان کی گورنری پر مامور رہا۔

سبکتگین نے بستر مرگ پر اپنے چھوٹے بیٹے اسمٰعیل کو غزنہ کی عنان حکومت سپرد کر دی۔ محمود نے اسمٰعیل کو خراساں کی حکومت اس شرط پر پیش کی وہ غزنہ کی حکومت اس کے سپرد کر دے۔ اسمٰعیل نے انکار کر دیا۔ تو محمود نے فوج کشی کی۔ اسمٰعیل کو شکست ہوئی اور غزنہ پر پھر محمود کا قبضہ ہوگیا۔

تخت پر قابض ہونے کے بعد محمود نے غزنہ کی چھوٹی سی ریاست کو جو کہ ضابطہ میں امیر سامانہ تھا اسے ایک عظیم سلطنت میں شامل بلکہ تسلیم کرالیا۔ پھر اس عظیم الشان سلطنت کا حلیہ ہی تبدیل کر دیا اور پاک و ہند ترکستان اور ایران کے

مختلف حکمرانوں کو شکستیں دیں۔

برصغیر پر حملہ:

جب خلیفہ کی طرف سے محمود کو ''یمین الدولہ وامین الملت'' کا خطاب ملا تو اس نے عزم کیا کہ وہ ہر سال پاک و ہند پر حملہ آور ہو گا۔ پس اس نے پاک و ہند پر سترہ (17) حملے کیے۔

مگر یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جو مختصر حصہ اپنی حکومت میں شامل کیا وہ بھی فوجی ضروریات کے تحت تھا۔ محمود کی آماجگاہ وسط ایشیا اور ایران تھے جن کو فتح کر کے محمود ایک وسیع غزنوی سلطنت کی بنیاد قائم کرنا چاہتا تھا۔ وسط ایشیا اور ایران میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں محمود اپنے آپ کو ان امراء سے بلند کر کے ان پر اپنا وقار برقرار رکھنا چاہتا تھا اس کام کے لئے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔ پہلی فاتحانہ شہرت و بدبہ اور دوسری چیز دولت۔

یہ دونوں چیزیں محمود نے برصغیر پاک و ہند سے حاصل کیں۔ برصغیر پر اس کی فاتحانہ فوج کشی کی صدائے بازگشت دور دراز کے ممالک تک پہنچی اور سلاطین عجم کے دلوں میں اس کی دھاک بیٹھ گئی اور یہ حیثیت اس کی ایک غازی اور بت شکن کی تھی۔ خود خلیفہ بغداد اس سے بہت متاثر ہوا۔

باباش کا کردار:۔

مشہور ہے کہ باباش ایک باہمت آدمی تھا اور عوام کی بہبودی دل سے چاہتا

تھا۔اس کے بارے میں روایت کہ جب کبھی اسے معلوم ہوتا کہ کسی کسان کی کھیتی تباہ ہوگئی ہے تو اس کا ذمہ دار وہ گاؤں کے نمبر دار کو ٹھہراتا اور اس سے جواب طلبی کرتا کہ اس نے آدمی کی مدد کیوں نہیں کی۔اس کے علاوہ وہ عیسائی اس کے حلم اور شرافت نفس کے خوب راگ الاپتا۔اس کی وجہ شاید یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی وجہ شاید یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے عیسائی رہنماؤں اور مبلغوں کو تبلیغ کرنے کی عام اجازت دے رکھی تھی۔بلاش نے مملکت کی آبادی کے لئے نئے شہر بھی آباد کئے۔ ان شہروں میں ''بلا آباد'' کو شہر کی آبادی کے نزدیک آباد کیا۔''بلاش آباد'' مدائن کے قریب آباد کیا اس شہر کا بعد میں نام بدل کر ''ساباط'' رکھ دیا گیا۔اس طرح ''مرو'' کے قریب شہر ''بلاش کرد'' کے نام سے آباد کیا۔

''بلاش کرد'' نے اس سرزمین پر تقریباً چار سال تک حکومت کی۔

قباد اول

قباد اول کے دو دور گزرے ہیں۔

487ء تا 497ء پہلی مرتبہ

501ء تا 503ء دوسری مرتبہ

بلاش کے بعد فیروز کا بیٹا قباد 487ء میں تخت نشیں ہوا اور 497ء تک حکومت کی۔اس بادشاہ کی سلطنت کے دو دور ہیں۔پہلا دور 487ء سے 497ء تک اور پھر 501ء سے 503ء تک۔

ان دونوں حکومت کے درمیان ان کے دو دور اور ہیں ایک 501ء سے

521ء پھر 497ء سے 501ء تک اس کا بھائی جاماسب متمکن رہا۔

ایک روایت کے مطابق قباد کو تخت پر بٹھانے میں اس کے ایک جنرل ''سوخرا'' کا بہت عمل دخل تھا۔ چنانچہ سوخرا کو بدستور سپہد ار یعنی فوجی جنرل کے عہدے پر فائز رکھا اور ساری فوج اس کی نگرانی میں دیدی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ بدخواہوں نے ''سوخرا'' کے بارے میں اس کے کان بھرے اور قباد پر واضح کرنے کی کوشش کی......

''سوخرا ایک جاہ طلب اور خطرناک شخص ہے اور وہ اس بنا پر وقت کے بادشاہ پر چھایا رہنا چاہتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی وقت اس کے دماغ میں حکمرانی کا خیال پیدا ہو جائے اور وہ سلطنت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو جائے۔''

اس لئے قباد نے سوخرا کو ''فارس'' کا گورنر بنا کر بھیج دیا اور مرکزی کومت سے اسے دور کر دیا۔

سوخرا کا قتل:۔

اس پر ''سوخرا'' کے حاسدوں کی تسلی نہ ہوئی۔ چنانچہ سوخرا کو ایک زبردست رقیب بلکہ دشمن ''شاہپور مہربان رازی'' کے ذریعہ قتل کرا دیا گیا۔ اس قتل کی جب خبر پھیلی سارا ملک ایران قباد کے دشمنوں سے بھر گیا۔

ایک روایت کے مطابق ''سوخرا'' کے قتل کے بعد ملک کے تمام امرا نے متفقہ فیصلہ کیا تھا کہ

نمبر 1 قباد کو اس قدر بے گناہ قتل کرنے کے جرم کے تحت حکومت فوراً بے دخل کر دیا جائے۔

نمبر 2 اس کی جگہ اس کے بھائی (جاماسب) کو تخت پر بٹھایا جائے۔

لیکن اس سلسلے میں عبداللہ رازی نے اسے کچھ اس طرح بیان کیا ہے: سوخرا کے ایک زبردست رقیب بلکہ دشمن شاہ پور مہربان رازی نے قباد کو چکھ اس طرح مشتعل کیا کہ قباد کے دل میں سوخرا کے بارے میں نہ صرف نفرت بلکہ قہر پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس نے حکم دیا۔ "سوخرا کو پابجولاں دربار میں پیش کیا جائے۔" اور اس کو گرفتار کرنے کے لئے شاپور مہربان رازی شاہی فرمان لے کر قید کرنے خود گیا اور اسے زنجیروں سے جکڑ کر قباد کے دربار میں لایا۔ یہ حالت دیکھ کر تمام درباری تو ایک بار لرز گئے اور ان میں بے حد بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن قباد کو شاپور رازی نے کچھ ایسے انداز میں زہر آلود کیا ہوا تھا کہ اس نے فوراً سوخرا کو قتل کرنے کا حکم دیدیا۔ یہ سن کر امرا میں اور زیادہ بے چینی پیدا ہو گئی اور قباد پر سے ان کا اعتبار جاتا رہا۔ بہر حال "سوخرا" قتل کروا دیا گیا۔ اس کے قتل ہونے کی خبر جونہی ایران میں پھیلی۔ سارا ملک قباد کے دشمنوں سے بھر گیا۔

قباد کا پہلا دور:۔

ایک روایت ہے کہ سوخرا کے قتل کے بعد ملک کے تمام امرا نے مل کر

ایک کانفرنس منعقد کی۔ جس میں متفقہ فیصلہ کیا گیا کہ قباد کو اس قدر بے گناہ شخص کو قتل کرنے کے جرم میں تخت سے اتار دیا جائے اور اس کی جگہ اس کے بھائی ''جاماسب'' کو تخت پر بٹھایا جائے لیکن عبدالرازی کہتے ہیں:۔

قباد نے مزدکی مذہب قبول کرلیا تھا اور وہ اس کے پرچار کے پوری طاقت سے کوشاں تھے۔ اس نے اپنی توجہ امرا اور موبدوں کی قوت کو کم کرنے کی طرف کی اور اس سلسلہ میں قانون اشتراکیت جو مزدکی نے پیش کیا تھا' پھیلانے میں مدد دی جس کی بنا پر سارے ملک میں ایک عام شورش برپا ہوگئی جس کے نتیجے میں امرائے مملکت اور موبدوں نے مل کر اتفاق کر کے قباد کو تخت سے اتار دیا اور ایک تنہا جگہ نظر بند کر دیا۔ قباد کے پہلے دور میں جو اہم واقعات رونما ہوئے وہ حسب ذیل تھے:

نمبر 1 ہیاطلہ کے حملوں کی تیاری جاری رہی اور ایران کو اس کے لئے ہر وقت تیار رہنا پڑا۔

نمبر 2 ازمنستان میں شورش جاری رہی اور اس کے مقابلے کے لئے ہر وقت تیار رہنا پڑا۔

نمبر 3 طائفہ خزر نے قفقازیہ کی طرف سے ایران پر حملہ کر دیا۔ جسے قباد نے کامیابی کے ساتھ روک لیا اور حملہ آوروں کو ملک سے باہر دھکیل دیا۔

نمبر 4 ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی گئی جس کا بانی ''مزدک'' نامی

ایک شخص تھا۔اس کا مذہب کا نام ''مزدکی مذہب'' تھا۔
مزدک نے ایران میں زبردست ہنگامہ کیا جس سے بہت سی ساسانی حکومتیں متاثر ہوئیں۔پیشتر اس کے کہ ''جاماسب اوّل'' کا حال بیان ہو۔مزدک اور اس کے مذہب پر کچھ تحریر کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔



سلاطین غور:۔

علاؤالدین حسین کالقب جہاں سوز

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ غور کا پہاڑی علاقہ کابل اور ہرات کے درمیان واقع ہے۔ یہ علاقہ پہلے محمود غزنوی نے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا مگر غزنوی سلطنت کے زوال کے ساتھ غورا مارتوں میں اختلافات شروع ہو گئے تھے۔کئی لڑائیاں ہوئیں یہاں تک کہ 1151ء میں علاءالدین حسین نے بہرام شاہ غزنوی کوشکست دے کر غزنی پر قبضہ کرلیا اور پورے شہر کو آگ لگادی۔اسی وجہ سے علاءالدین حسین کالقب ''جہاں سوز''مشہور رہوا۔

محمد غوری:۔

1161ء مین تخت غور کے لئے غیاث الدین کا انتخاب ہوا۔اس نے غزنی پر چڑھائی کی اور قبضہ کر کے غزنی کی امارت اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین (غوری) کے سپرد کردی۔شہاب الدین نے معز الدین محمد غوری کالقب اختیار کیا۔دونوں بھائیوں میں بے پناہ یگانگت اور محبت تھی۔معز الدین محمد غوری غزنی اور دونوں بھائیوں میں بے پناہ یگانگت اور محبت تھی۔معز الدین محمد غوری غزنی اور ہندوستان کے معاملات میں خودمختار تھا مگر ساری سلطنت کی خارجہ پالیسی غیاث الدین کے ہاتھ میں تھی۔بڑا بھائی فہم وفراست اور دوراندیشی میں لاثانی تھا اور

چھوٹا بھائی بلند حوصلہ شجاع اور اولوالعزم تھا۔

معز الدین غوری کے حملے :۔

حکومت پر قبضہ سنبھالتے ہی محمد غوری نے اپنے بڑے بھائی سلطان محمود غزنوی کی طرح ادھر ادھر حملوں کا آغاز کر دیا۔ اس وقت وسط ایشیا میں خوارزم شاہ کی مضبوط حکومت قائم تھی اس لئے محمد غوری نے برصغیر پاک و ہند کا رخ کیا جہاں اس نے ایک مستقل اسلامی حکومت قائم کی۔

مہمات کا آغاز :۔

محمود کے زمانہ میں ملتان پر پھر اسمعیلی (قرامطہ) حاوی ہو گئے تھے۔ پس سلطان محمد غوری نے 1175ء میں حملہ کر کے ملتان پر قبضہ جما لیا۔ اس کے بعد اچ کے اہم قلعہ پر بھی قابض ہو گیا۔ پھر تینس ال بعد 1178ء میں ایک اسمعیل کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بجلی سے زیادہ تیز حملوں کی یہ کیفیت تھی کہ وہ بجلی کی طرح پاک و ہند میں نمودار ہوتا۔ راجاؤں کے جم غفیر اس کے آگے آگے فرار ہوتے۔ وہ مندروں کو مسمار کرتا اور فاتحانہ شکوہ کے ساتھ واپس ہو جاتا۔

برصغیر میں کوئی مستقل حکومت کا قیام اس کے پروگرام میں نہیں تھا۔ پنجاب اور ملتان کا جو حصہ سلطنت غزنہ میں شامل کیا گیا تھا وہ فوجی ضروریات کے تحت تھا۔ باقی مفتوحہ علاقوں میں اس نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ اس صورت میں محمود ہندو پاکستان کے لئے زیادہ اثرات کے حامل نہیں ہو سکتے تھے۔ تاہم کچھ اثرات لا ابدی

ہو سکتے تھے جو اس طرح ہیں:۔

محمود کے حملوں نے شمالی ہند کی فوجی کمزوری تمام ممالک اسلامیہ پر ظاہر ہو گئی۔ پس اس کا اگلا حملہ آئندہ حملوں کا پیش خیمہ تھا۔ پس بعد کے فاتحین اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حملہ آوار ہوئے۔ اس کے متواتر حملوں نے شمالی ہند کی ریاستوں کو اور زیادہ کمزور کر دیا اور ان کے فتح کرنے کا کام نسبتاً آسان ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی برصغیر اپنی دولت اور ثروت کے ایک بڑے حصے بھی محروم ہو گیا۔ محمود نے یہ دولت غزنی منتقل کر دی اور اس نے ان قیمتی اشیاء اور بے انتہائی قیمتی اشیاء سے اپنے مرکز کو بھر دیا۔

سلطان کے جانشین:۔

سلطان کی موت پر اس کے جانشینوں میں تخت وتاج کے حصول کا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ سلطان نے احمد تگین کو لاہور کا حاکم مقرر کیا تھا۔ نیا تگین نے 1034ء دریائے گنگا کے کنارے کنارے پیش قدمی کر کے بنارس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کی خبر جب سلطان کو ملی تو اس نے اپنے ہندو سالار تلک کو اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ تلک نے لاہور پہنچ کے باغیوں کو شکست دی اور پھر 1037ء مین سلطان خود وہاں پہنچا اور ہانسی کے مضبوط قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ سلطان مسعود پلٹ کر ان کے مقابلہ پر گیا۔ مگر باغیوں کی فوج کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ دوسری طرف سلجوقیوں نے غزنوی سلطنت پر حملہ کر دیا اور نیشاپور پر قبضہ کر لیا۔ سلطان مسعود ان کے مقابل آیا مگر شکست کھا کر لاہور کی طرف ہٹ گیا۔ اسی

دوران اٹک اور راولپنڈی کے درمیان فوج نے بغاوت کردی اور اسے قتل کر دیا۔

سلطان مسعود کے لڑکے سلطان مودود نے چھ سال تک جنگ کی مگر نا کام رہا۔ مسلم مجاہدین کی سرفروشی نے راجہ کے عزائم کو نا کام بنا دیا۔ لاہور میں گنج شہیداں کے نام سے جو قبرستان ہے وہاں وہ تمام شہدا دفن ہیں جو اس معرکہ میں کام آئے تھے۔

سلطان مسعود کے لڑکے سلطان ابراہیم کا 1059ء سے 1099ء تک یعنی چالیس سال تک کا عہد ایک کامیاب عہد ہے۔ اس نے سلجوقیوں سے صلح کر کے امن قائم کیا تھا۔ 1079ء میں اس نے جنوبی پنجاب میں اجودھن (پاک پٹن) کو فتح کیا۔ اس کے سردار شیبانی نے بنارس، تھانیسر اور قنوج پر کامیاب یلغاریں کیں۔ ابراہیم کے بیٹے سلطان مسعود نے امن و امان سے حکومت کی مگر اس کے بعد غزنوی حکومت تیزی سے زوال پذیر ہوگئی۔

ابراہیم شاہ 1118ء میں برسر اقتدار آیا پھر سلاطین غور نے زور پکڑا اور آخر کار 1151ء میں علاءالدین جہاں سوز نے غزنی پر حملہ کیا اور اسے نذر آتش کیا۔ حتیٰ کہ 1160ء میں خسرو ملک جب لاہور مقیم تھا تو سلطان محمد غوری نے آخری غزنوی سلطان خسرو ملک کو گرفتار کر کے دولت یمینی کا خاتمہ کر دیا۔

لاہور:۔

سلطنت غزنوی کے آخری دور میں لاہور شہر کی یہ کیفیت تھی کہ لاہور، علم و ادب اور مسلم ثقافت کا مرکز بن گیا تھا۔

غزنی کو اس وقت مشرق میں مسلم ثقافت کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ شہزادہ شہزاد یہاں کا حاکم تھا اس نے یہاں ایک خانقاہ تیار کرائی تھی جس کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ لوگ دور دور سے کھنچے چلے آتے تھے۔

بلاش کی وفات کے بعد فیروز کا بیٹا قباد 487ء میں تخت نشیں ہوا۔ مگر اسے جلد ہی فارس کا گورنر بنا کر بھیج دیا گیا سوخرا ایک جاہ طلب اور خطرناک شخص تھا۔ اس لئے مرکزی حکومت سے اسے دور رکھا گیا۔

سوخرا کے تمام امیر خلاف تھے اور اس کی کسی سے نہ بنتی تھی۔ چنانچہ سوخرا کے زبردست رقیب بلکہ دشمن شاہ پور مہمان رازی نے قباد کو کچھ اس طرح مشتعل کیا کہ قباد کے دل مینس وخرا کے بارے میں نفرت ہی نہیں غصہ اور قہر کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا۔ پس حکم دیا گیا ہے کہ سوخرا کو پابجولاں کر کے دربار میں پیش کیا جائے۔ پھر لطف یہ کہ اس کی گرفتاری کے لئے شاپور رازی کو حکم ہوا کہ وہ قباد کو پیش کرے۔ بلکہ قباد کو دربار میں لانے سے پہلے ہی اسے راہی ملک عدم کر دیا گیا۔

قباد کے سب لوگ خلاف ہو گئے تھے۔ قباد کے اس کے خلاف ہوتے ہی اس کا ٹھکانے لگا دیا گیا۔ سوخرا کے قتل ہونے کی خبر ایران میں پہنچی تو تمام لوگ قباد کے دشمن ہو گئے۔

قباد کا دوسرا دور:۔

ایک روایت ہے کہ سوخرا کے قتل کے بعد ملک کے تمام امراء نے مل کر ایک کانفرنس منعقد کی۔ یہاں تک کہ اس قتل کے سلسلے میں قباد کا عہدہ گھٹا دیا گیا۔

عبداللہ رازی لکھتے ہیں قباد نے مرز کی مذہب قبول کر لیا تھا اور وہ اس کا خوب پرچار کرتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قباد نے قانون اشتراکیت جومزدک نے پیش کیا تھا اسے پھیلانے میں قباد نے بہت مدد دی۔ اس وجہ سے ایک عام شورش برپا ہوگئی اور لوگ قباء کے اس قدر خلاف ہو گئے کہ اسے معزول کر کے ایک قید خانہ میں دال دیا گیا۔

اس مذہب کے بارے یں ایک بات وثوق سے کہی جاتی ہے کہ یہ مذہب خودقباد کا جاری کیا ہوا تھا۔

مزدک اوراس کا مطلب :۔

مزدک کون تھا؟

مزدک نیشاپور میں پیدا ہوا۔ اس نے خراساں کے شہر ''نساء'' میں پیغمبری کا دعویٰ کیا۔ اس کے باپ کا نام امداد تھا۔ وہ ایک خوبصورت مگر باطن نہایت ناپاک اور گندہ تھا۔ اس کے مذہب کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ وہ پیدائشی طور پر زرتشتی تھا۔ اس نے مذہب کا اعلان قباد اول کے زمانہ میں کیا اورقباد پر اس کا تنا اثر ہوا کہ وہ خودبھی مزدک ہوگیا بلکہ اس نے سرگرم حصہ لے کر ان کی تعداد میں اضافہ کیا۔ مزدک نوشیرواں عادل کے زمانہ میں قتل ہوا تھا۔

مزدکی مذہب :۔

اس مذہب کی بنیاد ایک شخص مزدک نیشاپوری نے رکھی لیکن بعض مورخین

اس سے اتفاق نہیں کرتے مزدک کی بنیاد کے بارے میں کچھ لوگ لکھتے ہیں کہ کسی اور زرتشی شخص نے اس کی بنیاد رکھی تھی اور کوئی کہتا ہے کہ اس کی بنیاد "بندوس" نامی ایک شخص نے رکھی لیکن تحقیق کے بعد پتہ چلا ہے کہ مزدک نامی ہی ایک شخص نے اس کی بنیاد رکھی ہے۔

اس مذہب کا مقصد دراصل مانوی مذہب کی اصلاح کرنا تھا۔ اس کی نافذ کردہ اصلاحات اس قدر زیادہ اثر انداز ہوئیں کہ اس نے ملک کی سیاسیات میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ خاص کر قباد اور نوشیرواں کے عہد میں اس کا جو چرچا رہا اس کے بعد پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔

اس مذہب کے بنیادی نظریات میں دو اہم عناصر ہیں:

ا: نور

ب: ظلمت

نور کو ظلمت کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ نور کے فعل کو قصد اور ارادے کے تحت بنایا گیا ہے۔ لیکن ظلمت کو اس کے برعکس بتاتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ظلمت کے تمام افعال بلا تاخیر اور ارادے کے ہوتے ہیں اور ایسے افعال بالکل اتفاقیہ سرزد ہوتے ہیں،۔

اس مذہب میں کچھ زرتشتی مذہب کے عناصر بھی شامل ہیں۔ مثلاً اس میں خیر اور شر کا مقابلہ جاری رہا کیونکہ نور کو ظلمت پر غالب تصور کیا گیا ہے۔ مذہب میں نظریہ ارتقاء کو بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

مانی نے اپنے مذہب میں عناصر خمسہ بیان کئے ہیں لیکن مزدک' عناصر ثلاثہ

کا قائل ہے اور یہ ثلاثہ عناصر مندرجہ ذیل ہیں:

نمبر 1 آگ

نمبر 2 پانی

نمبر 3 خاک

تصور الہ:۔

اور نور کے خدائے نور اور ظلمت کو خدائے ظلمت کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ چنانچہ خدائے نور کے بارے میں مزدک کا تصور یہ ہے کہ وہ عالم بالا میں ایک عالیشان اور نا قابل تسخیر تخت پر جا گزیں ہے بالکل ایسے جیسے مادی دنیا میں ایک ایرانی بادشاہ اپنے سر پر ہمایوں پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔ ساسانی بادشاہ اپنے ساتھ چار عہدیدار ضرور رکھتا ہے۔ اس طرح خدائے نور کے بھی چار بڑے بڑے برگزیدہ درباری ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

نمبر 1 تمیز

نمبر 2 عقل

نمبر 3 حافظہ

نمبر 4 خوشی

یہ چاروں عناصر (عہدیدار) دراصل خدائے نور کی قوت کا باعث ہیں،۔ ان چاروں قوتوں کے تحت سات وزراء بھی ہیں جو دنیا کا کاروبار چلاتے ہیں۔ پھر ان سات وزیروں کے ماتحت بارہ روحانی ہستیاں ہیں جو ان وزیروں کے

کاموں کی تکمیل میں مدد دیتی ہیں۔

عقیدے:۔

مزدک نے آہنسا پر بہت زور دیا ہے اور اس نے اپنے مقلداروں کو گوشت خوری سے باز رہنے کی تلقین کی ہے۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ گوشت کسی جاندار کی زندگی میں روح اور مادہ کے ساتھ کچھ نہ کچھ عرصہ ضرور رہا ہوتا ہے۔ اس لئے جس جگہ ایک مرتبہ روح بس جائے وہ جگہ بے حد مقدس ہو جاتی ہے۔ اسی لئے انسان کو انسان کا احترام ہی کرنا چاہئے۔

انسان کی کوشش یہ ہونا چاہئے کہ خدائے نور و ظلمت کی کشمکش میں خدائے نور کا ساتھ دے اور جہاں تک ہو سکے خدائے نور کی برتری قائم رکھے۔ اور انسان کی امداد کی ایک صورت یہی ہو سکتی ہے کہ عمدہ اخلاق اور عمدہ اعمال کو زیادہ سے زیادہ تقویت دے جبکہ منتہائے نظر ہی یہ ہونا چاہئے کہ اس کی زندگی کا مقصد خدا کے نور کو روشن رکھنا ہے۔

مزدکی عقیدوں میں سے سب سے اہم عقیدہ "اشتراکیت" ہے۔

اس عقیدے میں مساوات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انسان پیدا ہوتے ہیں ان کے حقوق بالکل برابر ہیں اور انہیں کسی بھی بنیادی حق سے محروم نہ رکھا جانا چاہئے۔ نہ کسی کے پاس اس قدر زیادہ دولت ہونی چاہئے کہ وہ اس کا شمار بھی نہ کر سکے۔ اور نہ دنیا میں کوئی ایسا شخص رہنا چاہئے جس کا ہر لمحہ فکر معاش میں گزرے۔ یعنی اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں،

ایک انسان کے فائدے یا استعمال کے لئے بنائی گئی ہیں۔ان سے ہر شخص یکساں طور پر فائدہ حاصل کر سکے۔یہی وجہ تھی کہ اس نے قباد کو تجویز پیش کی کہ وہ اپنی دولت کو مستحقین میں تقسیم کرے اور اپنے امرا کو بھی ہدایت کرے کہ وہ اپنے غربا کو اپنی ملکیت کی حد تک تقسیم کریں۔مگر اس سے اس کا وقار زائل نہ ہونا چاہئے اور مفلس لوگ بھی آسودہ ہو جائیں کیونکہ اس کا خیال تا کہ کہ ہر بادشاہ اورعوام کے دلوں کو ہی ہاتھ میں لے کر بہتر کام لیا اور کیا جا سکتا ہے۔

مزدک کے مذہب میں عورت کا مقام:۔

مزدک عورت کو گھریلو سامان یا ذاتی ملکیت سمجھنے کے خلاف عورت کو وہ غلام دیکھنے کو پسند نہ کرتا تھا۔اس کے عقیدے کے مطابق عورت مرد کی ایک کمزور لیکن مخلص ترین دوست ہے۔جو ذہنی طور پر مرد کی اسی طرح امداد کر سکتی ہے جس طرح ایک مرد کر سکتا ہے۔مساوات کا فارمولا وہ عورتوں کے حق میں بھی استعمال کرتا ہے۔

طبری لکھتا ہے کہ مزدک نے ماں بہن اور بیٹی سے شادی کرنے کو حلال قرار دیا۔

قحط کے دوران مزدک کی کارروائی:۔

قباد کے تخت نشین ہوتے ہی ایران ایک زبردست قحط کا شکار ہو گیا۔لوگوں نے گھاس پھوس اور جانور تک کھائے۔انہی دنوں میں مزدک نے اپنے مذہب کا

اعلان کیا ہوا تھا اور اس نے اپنا نظریہ اشتراکیت لوگوں میں پیش کیا ہوا تھا جس کی وہ عملی طور پر تلقین کرتا پھرتا تھا۔

کچھ لوگ جمع ہو کر اس کے پاس آئے کہ قحط کو دور کرنے اور روٹی اناج مہیا کرنے کا کچھ بندوبست کرے۔ ثعالبی نے اس مسئلے کو حل کرنے میں مزدک عوام کا یہ پیغام لے کر قباد کے دربار میں حاضر ہوا اور بڑی سنجیدگی سے اس سے سوال کرنے لگا کہ حضور! میں آپ سے ایک مشورہ لینا چاہتا ہوں"

قباد نے کہا..... "ہاں ضرور......"

"اس شخص کو فوراً قتل کر دینا چاہئے۔"

مزدک نے پھر کہا۔

اگر کوئی شخص کسی بے گناہ کو زنداں میں ڈال کر اس کو خوراک نہ دے اور اسے اس طرح مار ڈالے تو ایسے ظالم کے ساتھ کیسا سلوک ہونا چاہئے۔

قباد پھر چونک کر بولا:

"ایسے شخص کو فوراً تہہ تیغ کر دینا چاہئے۔"

یہ دونوں جواب سن کر مزدک بادشاہ کو آداب بجا کر وہاں سے نکالا اور عوام کو اکٹھا کر کے کہنے لگا۔

"میں نے آج سارا مسئلہ بادشاہ سے طے کرلیا ہے۔ جن جن امرا کے پاس اناج کا ذخیرہ ہے اور انہوں نے ذاتی استعمال کے لئے محفوظ رکھا ہے۔ آج آپ کو بادشاہ کی طرف سے اجازت ہے کہ ان کو لوٹ لیں۔"

یہ حکم سنتے ہی وہ اناج کے انباروں پر ٹوٹ پڑے اور جس کے ہاتھ جو آیا وہ

لوٹ کے لے گیا۔قباد کو جب اس لوٹ مار کی خبر ملی تو اس نے مزدک سے اس کی وجہ پوچھی۔

مزدک نے جواب دیا:

''حضور سے اجازت لے کر ہی ایسا کیا گیا ہے یعنی جو گفتگو آپ کے اور میرے درمیان ہوتی تھی اس کا پس منظر یہی بات تھی۔''

قباد یہ سن کے لا جواب ہو گیا۔

مزدک کا فروغ اور اس کا حشر:۔

مزدک کو زیادہ فروغ اس وقت حاصل ہوا جب ساسانی بادشاہ قباد اول نے اس کے مذہب کو قبول کر لیا اور اس نے مزدک کے نظریہ اشتراکیت کو ایران میں عام کرنے کی کوشش کی۔اور یہی دور مزدک کے انتہائی عروج کا دور تھا کہ عوام نے اس نظریہ کے خلاف بغاوت کر دی۔اور بادشاہ کو پکڑ کر نظر بند کر دیا۔قباد بہر حال بعد ازاں نظر بندی سے فرار ہو کر دوبارہ سلطنت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔لیکن دوبارہ سلطنت حاصل کرنے کے بعد اس کی توجہ اس مذہب کی طرف سے کچھ کم ہو گئی۔

سوخرا کا بیٹا

قباد کی موت کے بعد اس کا بیٹا خسرو اول (مشہور بہ نوشیرواں عادل) تخت نشیں ہوا۔نوشیرواں اس مذہب کا سخت مخالف تھا۔اس نے اس مذہب کو سختی سے

دبانے کی کوشش کی۔ایک روایت کے مطابق اس نے مزدک اور اس کے ایک لاکھ حامیوں کہ تہہ تیغ کرادیا۔مزدک کے قتل کے بعد یہ مذہب کچھ عرصہ کے لئے پردہ خاموشی میں رہا۔پھر ایران پر مسلمانوں کے قبضہ کرنے کے بعد اس مذہب نے پھر سر اٹھایا مگر وہ ہمیشہ کے لئے کچل دیا گیا۔

جاماسب اول

498ء سے 501ء

جاماسب اپنے بھائی قباد کی معزولی کے بعد 498ء میں تخت نشیں ہوا۔

"تین خودسر"

جاماسب اول اپنے بھائی قباد کی معزولی کے بعد 498ء میں تخت نشیں ہوا۔

جاماسب جن حالات میں تخت نشیں سوا تھا وہ تو ظاہر تھے یعنی ایک سوا خرا' بے گناہ کا قتل اور دوسرے مزدکیوں کی شورش پس عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ اس نے حکم جاری کیا کہ قباد کو گرفتار کر کے اور اسے زنجیروں میں جکڑ کر سوخرا کے بیٹے بزرمہر کے حوالے کیا جائے تا کہ وہ اس اپنی مرضی کے مطابق اپنے باپ کا انتقام لے لے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب قباد زنجیروں میں مقید ہو کر بزرمہر کے سامنے آیا تو بزرمہر نے اس کو محض اس خیال سے معاف کر دیا کہ وہ ایک بادشاہ رہ چکا تھا اور رعیت کے ہاتھوں بادشاہ کا قتل کرایا جانا مناسب نہیں۔ پس اس نے قباد کو معاف کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور بقاد کے ساتھ نہایت ہی حسن سلوک کا اظہار کیا۔ اس اعلی درجے کے شائستہ سلوک سے قباد سخت شرمندہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جو اس کے ساتھ برا سلوک کیا تھا اس پر ندامت محسوس ہوئی۔

پس اس نے بزرمہر سے اپنے گناہ کی معافی مانگی اور اسے بتایا کہ جو کچھ ہوا

یہ سب غلط فہمیوں کی بنا پر ہوا۔اس نے یہ بھی بتایا کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم اور تمہارے باپ نہایت اصیل خاندان کے چشم و چراغ ہو اور تم میں خلوص اور احترام کا جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔اس کے ساتھ ہی قباد نے بزرمہر کے سامنے تجویز دی کے ہم دونوں مل کر "جاماسب" کی حکومت کا تختہ الٹ سکتے ہیں۔پس انہیں اس کام کے لئے کوئی تدبیر سوچنا چاہئے۔

جاماسب تخت سے دست بردار

آخر کار جاماسب قید کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور وہ سیدھا شاہ ہیاطلہ کے پاس پہنچا۔ہیاطلہ کے بادشاہ نے اپنی بیٹی کی شادی قباد کے ساتھ کردی اور اس کو ایرانی تخت کی بازیابی کے لئے تیس ہزار فوج عطا کی۔پھر جونہی قباد کے مسلح ہو کر دارالخلافتہ کے نزدیک پہنچنے کی خبر جاماسب کو ملی تو اس نے فوراً اپنا ایک موبدان موبد کو قباد کی طرف روانہ کیا اور اسے پیغام بھیجا کہ:۔

بھائی صاحب آپ کا آنا مبارک ہو لیکن میں خود بخود تخت ایران ایک شرط پر چھوڑ دیتا ہوں کہ تم کسی قسم کے کشت وخون سے باز رہو۔قباد نے یہ تجویز مان لی اور جاماسب قباد کے حق میں دست بردار ہو گیا۔

یہ واقعہ 501ء کا ہے۔

قباد کی دوبارہ بادشاہی

(501ء سے 531ء تک)

قباد اول نے اپنے بھائی جاماسب کے تخت سے دست بردار ہونے کے بعد 501ء میں پھر سریر آرائے سلطنت ایران ہوا۔ اور اس بار تخت پر بیٹھ کے سب سے پہلے اس نے یہ کام کیا "سوخرا" کے بیٹے بزرمہر (بخرمہر) کو اپنا وزیر خاص بنا لیا۔

بزرمہر نے قباد کی اس وقت بھی مدد کی جب وہ ہپتالیوں یعنی ہیاطلہ کا لشکر لے کر جاماسب پر حملہ کرنے اور تخت حاصل کرنے کے لئے آیا تھا۔

خسرو نوشیرواں

(ایک روایت)

ایک روایت ہے کہ جب قباد اور اس کے ساتھی جاماسب سے تخت حاصل کرنے کی غرض سے نیشاپور کے علاقے اسفرابن کے شہر میں پہنچے تو ایک کسان کے یہاں کچھ دن قیام کیا۔ اس دہقان کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ قباد اس کو دیکھتے ہی دل دے بیٹھا تھا۔ سوخرا کا بیٹا بزرمہر اس وقت قباد کے ہمراہ تھا۔ اس کو اس معاملے کا پتہ چلا تو اس نے باقاعدہ رسمی طور پر اس کسان سے درخواست کی کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی ایران کے بادشاہ سے کرا دے۔ چنانچہ اس کی رضامندی کے بعد شادی بھی ہو گئی۔ شادی کے بعد قباد نے مروارید کا ایک خوبصورت ہار اپنی بیوی

کے گلے میں ڈال دیا اور وہاں صرف ایک ہفتہ قیام کیا اور پھر اپنے ارادے کی تکمیل کے لئے روانہ ہو گیا جو ہیاطلہ کی فوج کی مدد سے کامیاب ہو گیا۔

اس دوران اس دہقان زادی کیہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس بچے کا نام قباد نے کسریٰ رکھا۔ یہی بچہ بعد میں خسرو اول نوشیرواں عادل کسریٰ بن کر دنیا میں خورشید درخشاں بن کر چمکا۔

قباد دوسری مرتبہ بادشاہ بن کے آیا تو اس نے نئی نئی خصوصیات کو اپنایا۔ اس کو اپنے پہلے دور حکومت سے پتہ چل گیا تھا کہ ایرانی عوام پر حکومت کرنے کے لئے کون کون سے تقاضوں کو مدنظر رکھنا ازبس ضروری ہے۔ چنانچہ اس اندازے میں وہ بہت کامیاب ہوا اور اس نے مزید تیس سال تک حکومت کی۔ اس کے اس دور کے مندرجہ ذیل واقعات قابل ذکر ہیں:

نمبر 1 عوام کی بہبود اور ٹیکسوں سے معافی

نمبر 2 رومیون سے جنگ 503ء میں

نمبر 3 سفید ہنوں سے جنگ 503ء

نمبر 4 مزدکیوں کا قتل

نمبر 5 رومیوں سے پھر جنگ

عوام کی بہبود اور ٹیکس سے معافی:۔

قباد نے اس مرتبہ رعایا کی بہبود اور توجہ پر زیادہ زور دیا۔ اس نے لوگوں کو نئے نئے شہر آباد کر کے دیئے۔ ان شہروں میں ارجان' قبادخسرہ' قبادیاں' رومیوں کو

شکست دینے کے بعد جو خراج ان سب سے حاصل ہوتا اوس کا بیشتر حصہ وہ عوام کی خوشحالی پر صرف کرتا۔عوام کی بھلائی کے سلسلے میں ایک روایت بہت مشہور ہے۔ ایک دن قباد شکار کے لئے بزرمہر کے ساتھ نکلا۔راستے میں اناروں کا ایک باغ دیکھا۔اس باغ میں ایک بچے کو زارے زار روتے دیکھتے ہوئے قباد نے گھوڑا روک لیا۔

بچے کی ماں اس بچے کے قریب کھڑی تھی۔بچہ دراصل ماں سے انار مانگ رہا ہے لیکن اس کی ماں انار لینے سے منع کر رہی تھی۔پس قباد نے اس بچے کی ماں سے دریافت کیا:

''تم اس بچے کو آخر اس قدر کیوں رلا رہی ہو؟''

بچے کی مکاں نے بھرائی آواز میں جواب دیا:

اس باغ میں ایران کے بادشاہ قباد کا حصہ ہے اور جو آدمی انار توڑنے کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔وہ اب تک یہاں نہیں پہنچے۔مجھے ڈر ہے کہ اگر میں ایک انار توڑ کے بچے کو دیدیا تو بادشاہ کے حاکم بادشاہ سے کہہ کر اسے سزا دلا دیں دے۔''

مگر قباد نے اسی وقت حکم دیا:

''بحکم شاہ' تمام کاشتکاروں کا مالیہ معاف کیا جاتا ہے تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ خوشحال اور مالدار زندگی گزاریں۔''

قباد اور رومیوں کی پہلی جنگ:۔

432ء میں ایران اور روم کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا کہ فوج کو سالانہ مقررقم کا دا کی جائے گی۔ پھر بعد میں رومیون نیت یہ بقایا رقم ادا کر دی۔ پھر بھی قباد اور رومیوں میں جنگ شروع ہوگئی۔ رومیون کو کئی جنگیں لڑنا پڑیں جب یہ معاملہ ختم ہوا اور عمیدہ کا شہر ایران کو مل گیا۔

سفید ہنوں سے جنگ:۔

شہنشاہ قباد جب ازفستان سے واپس ہوا تو یہ جنگ سفید ہنوں اور ایرانیوں میں ہوئی جو دس سال تک جاری رہی۔ یہ جنگ خود بخو د بند ہوگئی اور کوئی نہ ہارا نہ جیتا۔ اس دس سال کے دوران مزدکیوں کی کثیر تعداد قتل ہوئی اور اس تحریک کا زور ٹوٹ گیا۔

خسرو اول (نوشیرواں)

530ء میں خسرو اول (نوشیرواں) کا انتقال ہوا۔

اس تاجدار نے پورے چالیس سال تک ایران پر حکومت کی۔ اس کے بعد خسرو اول تخت نشیں ہوا اس کا اعلان خسرو نے اپنی زندگی میں کر دیا تھا۔

نوشیرواں کا لفظ انوشگ اور رواں سے مل کر بنا ہے۔ یہ دونوں الفاظ ساسانی ہیں۔ خسرو اول یعنی نوشیرواں شہنشاہ قباد کے بعد تخت نشیں ہوا۔ جن کے معنی ہیں ''حماوبداں روح'' ایران کا یہ زریں مزین دور ہے اس شہنشاہ (نوشیرواں) کے

عہد کے مشہور واقعات مندرجہ ذیل ہیں:

نمبر 1 رومیوں کے ساتھ صلح کا پہلا معاہدہ

نمبر 2 ایرانی سلطنت کی انتظامی تقسیم

نمبر 3 فتح آطا کیہ

نمبر 4 لازیکا کی مہم

نمبر 5 رومیوں کے ساتھ دوسرا معاہدہ

نمبر 6 ترک خاقان کی شکست

نمبر 7 یمن کی فتح

نمبر 8 رومیوں سے تیسری جنگ

ان کے علاوہ نوشیرواں نے جو قابل قدر کارنامے انجام دیئے وہ اس طرح درج ذیل ہیں۔

نمبر 1 ایرانیوں کی سربلندی کے لئے نوشیرواں کی کامیابیاں

نمبر 2 مالیات کی درستی

نمبر 3 زراعت کی ترقی

نمبر 4 دین کی خدمت

نمبر 5 اعلیٰ فوج کی تشکیل

نمبر 6 علم دوستی

نمبر 7 نئے نئے شہروں کی آبادی

نمبر 8 اخلاقی بلندی۔ رعایا سے ہمدردی

رومیوں سے پہلا معاہدہ:۔

قباد کے مرتے ہی ایرانی اور رومی افواج میں جنگ ختم ہوگئی۔ قیصر روم جسٹنین، اطالیہ اور افریقہ میں جنگی کاروائیوں میں مصروف تھے۔ ان کاروائیوں سے جسٹنین نے یہ مناسب خیال کیا کہ ایرانی حکومت سے کسی قسم کی کشیدگی نہ رکھنا چاہئے۔ پھر 532ء میں روم نے اپنے ایلچی نوشیرواں کے پاس روانہ کئے اور صلح پیشکش کی۔ نوشیرواں چونکہ خود ایک صلح پسند شخص تھا۔ اس نے رومی تجویز کا دل سے خیر مقدم کیا۔ پس روم اور ایران میں مندرجہ ذیل باتوں پر ایک صلح نامہ قرار پایا:

شرائط نامہ تفصیل:۔

نمبر 1 روم کاکیشیا کے علاقے کی حفاظت کے لئے ''دربند'' کے مقام پر متعین ایرانی فوج کے اخراجات باقاعدہ ادا کرے گا۔ روم ہر سال ایران کو گیارہ ہزار سونے کے سکے دے گا۔

نمبر 2 ''قلعہ دارا'' روم کے قبضے میں رہے گا۔ بشرطیکہ وہ میسوپوٹیمیا میں اپنا صدر مقام نہ بنائے۔

نمبر 3 لازیکا کے علاقے میں طرفین کے مفتوحہ قلعے ان کے اصلی مالکوں کو واپس کئے جائیں،۔

اس صلح نامہ کے بعد ایران اور روم میں دوستی کا ایک نیا دور شروع ہوا اور ایک

عرصہ تک دونوں ایک دوسرے کے معاون بنے رہے۔لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا اور ایران اور روم میں پھر جنگ ہوئی جس کا نتیجہ صلح پر طے ہو گیا۔

ایرانی سلطنت کی انتظامی تقسیم:۔

خسرو اول یعنی نوشیرواں نے اپنی سلطنت کو مندرجہ ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا:

نمبر 1 حصہ اول

اس میں خراساں اور اس کے مضافات تھے جن میں طخارستان، زابلستان اور سیستان کے علاقے شامل تھے۔

حصہ دوم۔

اس میں رے، ہمدان، نہاوند، دینور، اصفہان، قم، کاشان، زنجان، ارمنستان، آذربائی جان، جرجان اور طبرستان کے علاقے شامل تھے۔

حصہ سوم

اس میں فارس، کرمان اور اہواز کے علاقے شامل تھے۔

حصہ چہارم

اس میں عراق سے یمن تک کا علاقہ اور حدود شام اور روم کی سرحدات شامل تھیں،۔

ثعالبی لکھتا ہے کہ نوشیرواں نے ان حصوں میں گورنر مقرر کیے اور انہیں سلطنت کے استحکام اور نگہبانی کرنے کی تاکید کی۔

فتح انطا کیہ 540ء

ایران سے صلح کرنے کے بعد ہمہ تن توجہ افریقہ اور اطالیہ کی طف ہوگئی تھی۔ ان حملوں میں رومیوں کو بہت فتح ہوئی تھی۔ اس دوران افریقہ اور اطالیہ کے جو سفیر ایران میں موجود تھے انہوں نے نوشیرواں کو روم کے خلاف بھڑکایا۔ ان کا خیال تھا کہ رومی، افریقہ اور اطالیہ فتوحات کے بعد زیادہ طاقتور بن کر ایران پر شدید حملے کر کے ایرانی حکومت کو ضرور پریشان کریں گے اس کے اتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ 933ء کی صلح میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ روم ایران کو کاکیشیا کے علاقے کی حفاظت کے لئے دربند میں متعین ایرانی فوج کے اخراجات برداشت کرے گا۔ اور اس کے لئے ہر سال ایران کو گیارہ ہزار سونے کے سکے دے گا۔ لیکن یہ معاہدہ صرف دستاویزات کی زینت بنا رہا اور اس پر عمل نہ ہوا۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اور رومیوں کے ساتھ خوش اسلوبی کے حالات کی بنا پر ایرانیوں نے اس شرط کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور اسے محض زینت طاق نسیاں بنا دیا گیا تھا لیکن افریقی اور اطالوی سفیروں کے احساس دلانے سے نوشیرواں نے روم سے رقم کا مطالبہ کر دیا۔ لیکن روم نے اس سلسلے میں لیت ولعل سے کام لینا شروع کر دیا۔ چنانچہ مجبوراً 540ء میں نوشیرواں نے رومیوں پر حملہ کر دیا۔

ایرانی فوجوں نے دارا، حران، قنسرین، حلب، حمص کے علاقے فتح کر کے انطاکیہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت اس شہر میں قیصر روم کا بھانجا اور دیگر اکابرین

سلطنت موجود تھے۔ ایرانی فوج کا حملہ اس قدر شدید تھا کہ اس کا سامنا نہ کر سکے اور تھوڑی سی فوج کے ساتھ وہ زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکے اور شہر کی تقریباً تمام عمارتوں کو مسمار کر دیا گیا۔ اس طرح ایرانیوں کو اس شہر سے کافی مقدار میں سونا چاندی، یاقوت، زمرد اور اسلحہ اور دیگر بیش بہا سامان ملا۔

ایرانی فوج کے ہاتھوں انطاکیہ کی تباہی نے نوشیرواں کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ اس نے حکم دیا:

''انطاکیہ شہر کا اصل نقشہ تیار کیا جائے اور اس نقشے کے مطابق مدائن کے قریب ایک نیا شہر آباد کیا جائے چنانچہ اس حکم کی تفصیل میں مدائن کے قریب ایک شہر آباد کیا جائے چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں مدائن کے قریب ایک شہر ''رومیہ'' کے نام سے تعمیر کیا گیا۔ جس میں انطاکیہ کے باقی لوگوں کو بسایا گیا۔''

لازیکا کی مہم:۔

لازیکا کا علاقہ اگرچہ رومی گورنر کی نگرانی میں تھا۔ رومی گورنر نے لزیکی بادشاہ کو خراج دینے پر مجبور کیا۔ اس سلسلے میں اس نے نوشیرواں سے مدد کی درخواست کی، یہ بات قابل ذکر ہے کہ لازیکا 522ء سے پہلے ایرانیوں کے ہی قبضے میں تھا لیکن 522ء کو اس کو رومیوں نے فتح کر کے اپنے علاقے کا حصہ بنالیا۔ پہلے تو نوشیرواں نے اس کی مدد کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ لیکن بعد میں سوچا کہ لازیکا کی فتح سے ایرانی سرحدیں بحیرۂ اسود تک پہنچ جائیں گی اور اس طرح ایران کو بحری تجارت میں زبردست فائدہ ہوگا۔

پس اس نے لازیکا کے بادشاہ کی امداد کا اعلان کرتے ہوئے اپنی ایک بہترین فوج کے حصے کو رومیوں سے جنگ کے لئے روانہ کردیا۔ جنگ کا آغاز دراصل ہنوں کی بغاوت کو فرو کرنے کے بہانے کیا گیا۔ سب سے پہلے ایرانی فوجوں نے "پترا" کی بندرگاہ پر قبضہ کیا۔ اس علاقے پر رومی گورنر نے اپنا واحد تسلط جمالیا تھا۔ اور اسی گورنر نے لازیکی بادشاہ کو خراج ادا کرنے کے لئے مجبور کیا تھا۔ اس طرح ایرانی فوج پیش قدمی کرتی ہوئی لازیکا تک پہنچ گئیں اور تھوڑی سی محنت کے بعد اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ اس طرح "لازیکا" ایک بار پھر ایرانی سلطنت کا جز بن گیا اور ایرانی سلطنت کی سرحدیں بحرۂ اسود تک پہنچ گئیں۔

نوشیرواں لازیکا پر اپنا قبضہ استواعرر کھنے کے لئے وہاں کی آبادی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے لگا۔ چنانچہ تبت سے رومی خاندانوں کو وہاں سے نکال کے ایران کے اندرونی علاقوں میں آباد کیا۔ اور بہت سے ایرانی باشندوں کا لازیکا میں آباد کیا۔

اس دوران نوشیرواں نے چند مشیروں کے کہنے پر لزیکی بادشاہ (گر بازلیس) کو راستے کا کانٹا تصور کرتے ہوئے مروا دینا چاہا۔ اس سازش کی خبر بازلیس کو بھی ہوگئی۔ چنانچہ وہ فوراً وہاں سے فرار ہو کر رومی شہنشاہ جسٹینین کے پاس چلا گیا۔

لازیکا ے کی فتح کے دوسرے ہی سال رومیوں اور ایرانیوں میں اس مسئلہ پر جنگ چھڑ گئی۔ اور یہ جنگ دونوں ملکوں کے درمیان آٹھ سال تک جاری رہی۔

بالآخر نوشیرواں کو بتایا گیا کہ یہ قبضہ ایرانی سلطنت کی استواری کے لئے ایک بوجھ ہے۔ اس طرح نوشیرواں کا وہ تمام پروگرام جو بحیرہ اسود کے ذریعہ دوسرے ملکوں میں تجارت کے سلسلے میں بنائے ہوئے تھا ملیا میٹ ہو گیا۔

رومیوں سے صلح 562ء:۔

لازیکا پر ایرانی قبضے اور رومیوں کی جنگ کی بنا پر ایران اور روم کے تعلقات ایک مرتبہ پھر کشیدہ ہو گئے۔ لیکن حقیقت میں دونوں ممالک اپنے اپنے مفاد کے پیش نظر ایک دوسرے سے اس قسم کے حالات میں رہنا مناسب نہیں سمجھتے تھے چنانچہ 562ء میں دونوں ملکوں کے مابین ایک اور معاہدہ طے پایا۔

اس معاہدے کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں:۔

نمبر 1 رومی حکومت لازیکی سرحدوں پر امن رکھنے کے لئے ایران کو ہر سال تیس ہزار سونے کے سکے دے گی۔

نمبر 2 ایرانی حکومت عیسائیوں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائے گی۔

نمبر 3 دربند کے علاقے کی حفاظت کرنا ایران کی ذمہ داری ہو گی۔

نمبر 4 قلعہ دارا کو صدر مقام نہیں بنایا جائے گا۔

نمبر 5 دونوں ملکوں میں آئندہ پچاس سال تک جنگ نہ ہو گی۔

خاقان کی شکست:۔

خاقان ترک نے مشرق کی طرف ایک بڑا علاقہ فتح کر کے ایک بہت بڑی سلطنت قائم کر لی تھی نوشیرواں 565ء میں اس طرف متوجہ ہوا۔ اور دریائے جیحون کے مغربی جانب کے تمام علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے تھے۔کہا جاتا ہے کہ ترک خاقان ''موکن خان'' کی لڑکی سے نوشیرواں نے شادی کی اور اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ''ہرمز'' رکھا گیا اور جو نوشیرواں کا ولی عہد بھی بنا۔

یمن کا جھگڑا:۔

چھٹی صدی عیسوی میں حبشیوں نے یمن پر قبضہ کرلیا تھا اور شاہ یمن جس کا نام سیف بن ذی یزن بتایا جاتا ہے فرار ہو کر روم چلا گیا تھا تا کہ وہاں سے فوجی امداد حاصل کر کے حبشیوں کو اپنے ملک سے نکالے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت حبشی اور رومی دونوں عیسائی قومیں بن چکی تھیں اس لئے قیصر روم نے ''سیف بن ذی یزن کو امداد دینے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ایک عیسائی ملک دوسرے قابض عیسائی ملک کو کیوں اور کیسے نقصان پہنچاتا ۔ پس سیف بن ذی یزن روم سے ایران پہنچا۔ وہاں اس نے نوشیرواں سے ملاقات کر کے سارے معاملے کو پیش کیا اور مدد کے لئے استدعا کی ۔نوشیرواں نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا اور اپنے ایک جنرل وہرز دیلمی کی نگرانی میں ایک لشکر عظیم سیف بن ذی یزن

کے ساتھ کر دیا۔ چنانچہ یہ لشکر ابلہ کی بندرگاہ سے حضرت مو کے ساحل پر اترا۔

ان دونوں حبشیوں کا بادشاہ ابو یکسوم بن ابر ہہ تھا۔ایرانی فوج کی آمد کی خبر سن کر اس نے ایک لاکھ حبشی فوج کو مقابلے کے لئے روانہ کیا۔ساحل پر ہی دونوں لشکر سف آرا ہو گئے۔ ایک گھمسان کی جنگ کے بعد ابو یکسوم مارا گیا اور ایرانی فوج کو فتح حاصل ہوئی۔

چنانچہ یمن کے بادشاہ سیف بن ذی یزن کے ہاتھ میں عنان سلطنت مسلسل خراج دینے کی شرط پر حوالے کر کے ایرانی افواج واپس آ گئیں۔

تیسری جنگ:۔

ایرانیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر رومی امرا اور دیگر رومی اکابرین گھبرا گئے اور کسی نے ان کے کان میں یہ بات ڈالی کہ ایران اب اس قدر مضبوط ہو گیا ہے کہ وہ کسی وقت بھی اس عارضی صلح کو توڑ کر اچانک روم پر حملہ کر سکتا ہے اس لئے ایرانی طاقت کو استعمال میں لا کر اسے ختم کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اس کو جنگی کارروائیوں میں مصروف رکھا جائے۔اور حملہ کرنے کے بعد خود دفاعی جنگ لڑی جائے۔جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ایرانی فوج اور سامان حرب کافی خرچ ہوتا رہے گا اور آہستہ آہستہ ان کی طاقت خود بخود زائل ہوتی رہے گی۔دوسری بات ان کے ذہن میں یہ آئی کہ اب بادشاہ خود ستر سال کا ہو گیا ہے اور اب وہ محض انتظامی

کارروائیاں کرنے کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں کرسکتا کیونکہ وہ اب کسی قسم کے حملے کی تاب نہیں لا سکے گا اور رومی ایران کو پریشان کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن آخر میں رومیوں کا یہ کواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

پھر 572ء میں قیصر روم نے ایرانیوں کے ساتھ صلح نامہ کو پس پشت ڈال کر ایران پر حملہ کر دیا۔ نوشیرواں کو جب اس حملہ کی اطلاع ملی تو وہ خود ایک کثیر فوج لے کر میدان جنگ میں آیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں رومی افواج کو شکست فاش سے دوچار کر دیا اور قلعہ دارا' ایرانیوں کے ہاتھ آ گیا۔ اس کے علاوہ نوشیرواں کے حکم سے انطا کیہ کے مضافات کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ ایرانی فوجیں برابر بڑھتی رہیں اور قیصر روم کو ہر جگہ مار کھا کر بھاگنا پڑا۔ آخر وہ اپنے پروگرام کے فیل ہو جانے اور بار بار ایرانیوں سےشکست کھانے کی وجہ سے تخت سے ہی فرار ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد کاؤنٹ ٹائبیریوس کو قیصر روم چنا گیا۔ کاؤنٹ ان حالات سے پوری طرح آگاہ تھا اور ہوا ایرانیوں کی طاقت اور استقلال سے بھی مکمل طور پر آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایران کے ساتھ ٹکر لینے سے ایرانی طاقت کم ہونے کے بجائے رومی طاقت کا اصراف زیادہ ہو گا اور ایک دشمن کو خواہ مخواہ اپنے دروازے پر کھڑا رکھنا پڑے گا۔ پس اس نے ایران کو پینتالیس ہزار سونے کے سکے دے کر عارضی صلح کی پیشکش کر دی جسے نوشیرواں نے قبول کر کے جنگ بند کر دی۔

قیصر روم نے ایک سالہ عارضی صلح کے فوراً بعد ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اپنی فوج طاقت کو زیادہ طاقتور بنانے میں وقت صرف کیا اور وہ رائن' ڈینوب اور سرحدی صوبوں میں افواج جمع کرنے میں مصروف رہا۔ اس جنگی کاروائی کے باوجود

قیصر روم کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ ایران پر حملہ کر سکے۔ چنانچہ اس نے اس عارضہ صلح کی معاد بڑھانے کے لئے ایران کو ایک اور درخواست دی اور ایرانی بادشاہ کو لکھا کہ مزید تین سال کی صلح کے لئے روم ایران کو تیس ہزار سونے کے سکے سالانہ ادا کیا کرے گا۔ ایران نے اس درخواست کو بھی منظور کرلیا۔

عارضی صلح چار سال گزر جانے کے بعد ایرانی منتظر تھے کہ رومی آئندہ صلح جاری رکھنے کے لئے پھر کوئی خط و کتابت کریں گے لیکن انہیں کسی قسم کی مزید تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ایرانی افواج آرمینیہ (ازفستان) پر قبضہ کر لیا اور بعد ازاں اس نے رومی آرمینیا پر بھی حملہ کر دیا۔ لیکن یہاں ایرانیوں کے چنداں فتح نصیب نہ ہوئی البتہ کچھ دیر کے بعد انہوں نے پھر زوردار حملہ کر کے رومیوں کو بھگا دیا۔ اس کے جواب میں ایرانی فوجوں نے پھر صفیں آراستہ کرلیں اور اسی سال یعنی 576ء میں رومیوں کو ایرانیوں کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی۔

اس شکست کے ڈیڑھ سال بعد تک رومی افواج اپنی سرحدوں میں بھی جنگی تیاریوں میں مصروف رہیں۔ آخر کار 578ء میں رومی فوج کے ایک جرنیل نے اپنی فوج کا ایک عظیم لشکر لے کر ایرانی سرحد پر حملہ کر دیا اور مشرقی میسو پوٹیمیا اور کردستان کے علاقوں کو فتح کر کے سلطنت روم میں داخل کرلیا۔ نوشیرواں ان دنوں اپنی زیادہ جسمانی کمزوری کی وجہ سے طسیفون گیا ہوا تھا۔ آخر 579ء میں نوشیرواں اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

اس طرح نوشیرواں نے تقریباً اڑتالیس سال تک حکومت کی اور اس کا دور ایرانی تاریخ میں ایک زریں دور تھا کیونکہ اس نے حکومت اور دیگر امور کے

سلسلے میں حسب ذیل اصلاحات کیں۔''

مالیات کی درستی:۔

نوشیرواں کے زمانہ سے قبل مالیہ وصول کرنے کا طریقہ درست نہیں تھا۔ چنانچہ ساسانی خاندان میں نوشیرواں سب سے پہلا بادشاہ تھا جس نے ملک کی مالیات پر تدبر سے غور کیا اور اس میں بہت سی اصلاحات کیں۔ ان اصلاحات کے نفاذ کی بنا پر ایک طرف تو رعایا نے حکام مال کے مظالم سے چھٹکارا حاصل کیا اور دوسری طرف ملک کے خزانہ کو بے حد فائدہ پہنچایا۔

زراعت کی ترقی:۔

نوشیرواں جانتا تھا کہ عوام کی بنیادی ضرورت روٹی ہے اور روٹی کی قیمت کا احساس اسے اپنے والد کے زمانہ میں شدید قحط پڑنے سے ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے ملک کے زمینداروں کو بہت سی آسانیاں اور رعایات دے کر ملک کے زرعی نظام کو بے حد بہتر بنایا جس سے نہ صرف زمیندار ہی خوش دلی سے اپنے کاموں میں مصروف رہنے لگے بلکہ بیکاری اور گداگری کا خاتمہ ہو گیا۔ کاشتکاروں کو ان کے اناج کی مناسب قیمت ادا کر دی جاتی تھی جس سے وہ دلی طور پر خوش ہو جاتے تھے اور اس کے بعد ان کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے حکومت کے مقرر کردہ مال افسروں کو خاص ہدایات جاری کر دیں جن کے ذریعہ کاشتکاروں کی مشکلات کا حل تلاش کر لیا جاتا تھا۔

دین کی خدمت:۔

مزدک دراصل ایک نہایت شر انگیز عنصر تھا۔ اس نے اپنے دلائل، چرب زبانی اور حیلہ سازی سے قباد جیسے مضبوط آدمی کو متزلزل کر دیا تھا اور عوام میں امن کا پیغام لانے کے بجائے ایک زبردست بے چینی کا پروگرام لے کے آیا تھا۔ دراصل وہ مذہبی روحانیت کے بجائے اشتراکیت کا پول جلدی کھل گیا۔ خود قباد اپنی آخری عمر میں مزدک سے متنفر ہو گیا مگر وہ اس پر ہاتھ ڈالتے گھبراتا تھا۔ آخری کار اس کی اس کسر اور کمی کو خود نوشیرواں نے پورا کر دیا۔ یوں نوشیرواں ایک بہت بڑے فتنے کو دبانے میں کامیاب رہا۔

مزدک کے علاوہ نوشیرواں کے کسی دیگر مذہب سے تعلق رکھنے والے شخص مزدک کوئی خاص ٹھیس نہ پہنچا سکا۔

دوسری طرف عیسائیوں کو اپنے مذہب کے پرچار اور سومات ادا کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہوئی اور اس سلسلے میں عیسائیوں کو بے حد آسودگی نصیب ہوئی۔

فوجی تشکیل:۔

نوشیرواں ایک زبردست امن پسند بادشاہ تھا لیکن اس میں جنگجویانہ جذبہ بھی بہت پایا جاتا تھا۔ اس لئے کوئی جنگوں میں خود جنگ کرنے میدان جنگ میں گیا تا کہ چند سپاہی نہیں بلکہ اس کا ہر فوجی جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہو کر

میدان میں جائے اور کامیابی حاصل کرے۔

سپریم کمانڈ:۔

تمام فوج کا سپریم کمانڈ بادشاہ خود ہوتا تھا۔اس کے نظام کو چلانے کے لئے افواج کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔اس کے لشکر میں ہنگامی ضرورتوں کے لئے ریزروفوجی بھی ہوتے تھے۔یہ فوری ضرورت کے سلسلے میں ایسے فوجی صوبائی گورنروں کے ماتحت ہوتےتھے۔اس محفوظ فوج کے مختلف یونٹوں کے مختلف کمانڈر ہوتے تھے۔یہ فوری ضرورت کے تحت کام کرتے تھے۔

گورنروں کی ذمہ داری:۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے کہ تمام فوج کا سپریم کمانڈر بادشاہ خود ہوتا تھا۔اس کے نظام کو چلانے کے لئے فوج کو علاقائی ضرورتوں کے تحت تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ان میں کچھ ریزروحصہ ہوتا جس سے ہنگامی حالات میں کام لیا جاتا تھا۔فوج کے مختلف یونٹوں کے مختلف کمانڈر ہوتے تھےجن کا ہیڈ گورنر ہوتا تھا یہ ریزرفوج اپنے فرائض کے بارے میں جواب دہ صرف بادشاہ کے سامنے ہوتی تھی۔

اس طرح مختلف یونٹ ہوتے جو بادشاہ کو جواب دہ ہوتے۔

ساسانی دور کا بہترین حربی انتظام اس کے زمانہ میں تھا جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

علم دوستی:۔

نوشیراں ایک بہت بڑا علم دوست اور عالم نواز بادشاہ تھا۔اس کے عہد میں اگر چہ علمی اعتبار سے تمام روم کو علم کی روشنی سے منور کرنیکی کوشش کی جاتیتھی۔ لوگوں کو جنگ میں حصہ لینے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا مگر انہیں تعلیم دینے کے لئے دور دور سے علماء بلوائے جاتے تھے۔کلیلہ ودمنہ اس دور کی یادگار تصنیف ہے۔اس کا ترجمہ سریانی زبان میں ہوا اور اسے ابن المقفع نے عربی زبان میں ڈھالا'پھر رودکی نے سے فارسی زبان میں پھر بعد میں اسے ساسانی پہلوی زبان میں ڈھالا گیا۔

شطرنج:۔

نوشیرواں نے اسے ہندوستان سے منگوا کر وہاں رائج کیا۔یہ کھیل حاضر دماغی بخشتا ہے۔

شفاخانہ:۔

اس کے علاوہ نوشیرواں نے ایک بہت بڑا شفا خانہ تعمیر کرایا۔جس میں ہندی'یونانی'رومی اور ایرانی طبیب رکھے گئے تھے۔یہ شفا خانہ ساسانی دور میں لاثانی تھا۔

نئے نئے شہر:۔

نوشیرواں کو جہاں علم و تحقیق سے محبت تھی اور جہاں وہ عوام کی بہبود اور خوشحالی رکھتا تھا وہاں وہ رعایا کی صحیح آبادکاری کا جذبہ بھی اس میں بدرجہ اتم موجود تھا اس کو نئے نئے شہر آباد کرنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ شہروں کے آباد کرنے کا مقصد اپنا نام کرنا نہیں تھا بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ ملک اور قوم کی بہتری ہو اور قومی جذبہ میں اضافہ ہو۔

پس اسی جذبہ کے تحت اس نے نوبندجان، رومیہ، اردبیل اور بحر کے شہروں کو آباد کیا۔

یہ شہر تاریخی اعتبار سے بہت مشہور ہوئے اس کے ساتھ ہی ان شہروں کی آبادی کے ساتھ طویل داستانیں وابستہ ہیں۔

اخلاقی بلندی اور ہمدردی:۔

نوشیرواں ساسانی دور میں شاید واحد بادشاہ ہے جس نے اپنی اخلاقی بلندیوں کا مظاہرہ کر کے ایک شہرت دوام حاصل کی۔ اس نے عدل و انصاف کی مثالیں قائم کیں۔ اس نے انسانی ہمدردی کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کر دیا۔ اس نے واقعی خود کو عوام کا خادم ثابت کیا اور کبھی اپنے دماغ میں شاہانہ تکبر نہ آنے دیا۔ وہ رموز سلطنت کو جاننے کے ساتھ رموز احوال کو بھی خوب سمجھتا تھا۔ زبردست زیرک ہونے کے باعث وہ معاملات کی گہرائی کو فوراً پہنچ کر مناسب ترین فیصلے کر سکتا تھا۔ وہ خود دلیر تھا اور عوام اور فوج کو دلیر بناتا تھا۔ اگرچہ وہ زرتشتی مذہب کا قائل تھا لیکن اس میں تعصب کا مادہ بالکل موجود نہ تھا۔ مسلمان مورخین نے بھی اس کی

بادشاہی کی تعریف کی ہے۔قدرت نے اسے بلند ترین ذہن اور فراخ ترین دل عطا کیا تھا۔

نوشیرواں کے عدل و انصاف اور اعتقاد کے بارے میں چند ایک تاریخی حقائق موجود ہیں جو اس طرح بیان کئے جاتے ہیں۔

حاکم آذربائیجان:۔

نوشیرواں نے اپنے تمام ماتحتوں کو حکم دے رکھا تھا کہ سب کے ساتھ انصاف کیا جائے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہ ہونے پائے اور اگر کوئی اس حکم کی خلاف ورزی کرتا ہوا پایا گیا تو اسے حکم عدولی کی سخت سزا دی جائے گی۔مگر آذربائیجان کا حاکم جو قباد کی افواج کا سپہ سالار تھا وہ اپنے ظلم کی وجہ سے بدنام تھا۔اس کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی کہ وہ ہر کام اپنی مرضی سے کرتا ہے۔اس پر نوشیرواں نے اسے وہاں سے ہٹا کر آذربائیجان کا حاکم بنادیا۔تا کہ وہ اپنے اختیارات کا غلط فائدہ نہ اٹھائے ۔اس حاکم نے اپنے محل کے لئے ایک زمین پسند کی مگر اس زمین کے ایک کونے پر ایک بوڑھی عورت کی جھونپڑی تھی ۔اسے بتایا گیا کہ یہاں محل بن رہا ہے تو کسی اور جگہ زمین پسند کر کے وہاں جھونپڑی بنالے مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی ۔نوشیرواں نے اس کی خفیہ انکوائری کرائی تو اسے بتایا گیا کہ اس حاکم کے پاس چھ لاکھ دینار ہیں۔ پانچ لاکھ دینار کا سونا اندی ہے۔ چھ لاکھ دینار کے جواہرات ہیں۔خراسان عراق اور فارس میں اس کے مکانات اور دکانیں ہیں۔ دو لاکھ بھیڑیں خچر اور گھوڑے ہیں ۔ان کے علاوہ اس کے قبضے میں سترہ سوترک

یونانی اور حبشی غلام ہیں اور تقریباً چودہ سولونڈیاں ہیں۔

یہ سن کر بادشاہ نے درباریوں سے سوال کیا کہ جس شخص کے پاس اس قدر مال ودولت ہواور وہ کسی مفلس پر اس قدر ظلم کرے۔اسے کیا سزادینی چاہئے؟''

سب نے یک زبان ہوکر جواب دیا:

''ایسے شخص کوتو عبرت ناک سزاملنی چاہئے۔''

چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا۔

''اس حاکم کوزنجیروں میں جکڑ کر دربار میں لانا چاہئے۔''

جب اسے دربار میں پیش کیا گیا تو بادشاہ نے حکم دیا۔

''اس کا سر قلم کر کے اس کی کھال اتاری جائے اور اس کی لاش کوکتوں کے حوالے کر دیا جائے۔]پھر اس کی کھال میں بھوسہ بھر کر محلے کے دروازے پر لٹکا دیا جائے اور پوری آبادی میں اس کی تشہیر کی جائے۔''

اس واقعہ کی تصدیق نظام الملک طوسی نے اپنی تصنیف ''سیاست نامہ''میں کی ہے۔

بھیڑیئے اورنوشیرواں

میر بلخی نے اپنی تصنیف روضتہ الصفاس میں اس طرح لکھا ہے:

ایک دفعہ نوشیرواں کے عہد میں ترکستان کے کچھ بھیڑیئے عراق کی سرحدوں میں داخل ہو گئے۔عراقی باشندوں نے کبھی بھیڑیوں کو نہ دیکھا تھا اور نہ ان کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔بھیڑیئے جب خوفناک آوازیں منہ سے نکالتے تو

عراقی باندے خوفزدہ ہو جاتے ۔ آخر کار یہ بات نوشیرواں کے دربار تک پہنچی ۔نوشیرواں نے مذہبی لوگوں کو بلا کر ان سے گفتگو کی۔ بزرگوں نے بتایا کہ بھیڑیئے اس ملک میں زیادہ پائے جاتے ہیں جہاں ظلم وستم زیادہ ہوتا ہے۔

نوشیرواں نے یہ سن کر ایک خاص دستہ خفیہ پولیس کا بنایا جس کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ وہ لوگ یہ دیکھیں کے ملک میں کس جگہ ناانصافی ہورہی ہے۔اس خفیہ پولیس کے دستے نے پورے ملک کا دورہ کیا اور بادشاہ کو رپورٹ پیش کی جس میں یہ درج تھا کہ ملک کے نوے فیصد حکام کے خلاف الزامات درست ہیں چنانچہ نوشیرواں نے ان نوے فیصد لوگوں کی گردنیں اڑوادیں۔یہ واقعہ بھی نوشیرواں کے وقت کا ایک خصوصی حیثیت کا حامل واقعہ ہے۔

نوشیرواں کا خواب اور بزرجمہر:۔

نوشیرواں کے بارے میں ثعالبی کی ایک روایت ہے کہ ایک رات بادشاہ نے سونے کے پیالے میں شراب پی جس میں سور اپنا منہ ڈالے ہوئے تھا۔ دوسرے دن صبح کو نوشیرواں نے اپنے موبدوں کو بلا کر خواب کی تعبیر پوچھی مگر کوئی موبد جواب نہ دے سکا۔

جب اس واقعہ کا بہت چرچا ہوا تو ایک طالب علم نے بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ اس کا سبب بتائے گا چنانچہ اس طالب علم کو بادشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔ طالب علم نے عذر کیا کہ وہ اس کا جواب بادشاہ کو تنہائی میں بتائے گا پس نوشیرواں نے اسے خلوت میں بلا کر جواب مانگا۔

طالب علم نے جس کا نام بز رجمہر تھا نے نوشیرواں کو بتایا کہ حضور! جاں بخشی ہو تو عرض کروں؟'' بادشاہ نے جاں بخشی کا وعدہ کیا۔ اس پر بز رجمہر نے بادشاہ کو بتایا:

''اے شاہ محترم حضور کی کنیزوں اور لونڈیوں میں ایک ایسا مرد شامل ہے جو آپ کی امانت میں خیانت کرتا ہے''۔

چنانچہ نوشیرواں نے اس سے دعویٰ کا ثبوت طلب کیا۔

بز رجمہر نے فوراً جواب دیا:

''آپ اسی وقت محلسرا کی تمام خواتین کو حکم دیں کہ وہ برہنہ ہو کر آپ کے سامنے سے گزریں۔''

چنانچہ اس بات پر حکم صادر ہوا کہ خواتین مادرزاد ننگی ہو کر یہاں سے ایک ایک کر کے نکل جائیں۔

پس اس حکم کے تحت تمام کنیزیں برہنہ ہو کر وہاں سے باہر چلی گئیں لیکن ایک نوجوان عورت کے لباس میں ان میں شامل تھا۔ وہ بادشاہ کے سامنے آنے سے گھبرایا۔ بہر حال نوشیرواں کو وہ نمک حرام ملازم مل گیا۔ اس نے اسی وقت اسے قتل کرا کر پھینکوا دیا اور بز رجمہر کو نہ صرف انعام واکرام دیا بلکہ بادشاہ نے اس کو اپنے پاس ایک اعلیٰ عہدے پر ملازم رکھ لیا۔

اب ذکر آتا ہے شاہ ہرمز چہارم

شاہ دوراں

579ء تا 590ء

..........☆...........

579ء میں خسرو اول (نوشیرواں عادل) کی وفات کے بعد اس کا بڑا شہزادہ ''ہرمز'' سریر آرائے سلطنت ایران ہوا۔ اس کے عہد حکومت میں مندرجہ ذیل مشہور ومعروف واقعات رونما ہوئے:

نمبر 1 رومیوں سے جنگ 579ء

نمبر 2 ترکوں کا حملہ 588ء

نمبر 3 بہرام چوبیں کی بغاوت

نمبر 4 پرویز کا ایران سے فرار اور قیصر روم کی پناہ

نمبر 5 ہرمز کی موت 590ء

نمبر 6 پرویز کا عازم ایران ہونا۔

نمبر 1

رومیوں سے جنگ

رومی حکومت کی یہ دلی خواہش رہی کہ ان کا سرحدی قلعہ دار کسی نہ کسی طرح سے اسے مل جائے اور وہ اس کے بدلے وہ ازرائین اور اس کا مضبوط قلعہ ابہو مان ایرانیوں کے حوالے کرنے پر تیار تھے۔ لیکن ایرانی حکومت دارا کا قلعہ چھوڑنے پر رضامند نہ ہوتی تھی۔ روم نے اس مسئلہ کو گفت وشنید کے ذریعہ سے

حل کرنے کی کئی کوششیں کیں لیکن مسئلہ طے نہ پا سکا۔ آخر کار تنگ آمد بجنگ آمد کا وقت آ گیا اور 579ء میں رومی فوجیں دریائے دجلہ عبور کر کے ایران پر حملہ آور ہو گئیں۔ اس کے مقابلہ میں ایران کا کافی لشکر مقابلہ پر نکلا۔

اس کشمکش میں میں ایران کے سرحدی علاقوں کی فصلوں کو کافی نقصان پہنچا۔ یہ جنگ وقفے وقفے کے بعد 588ء میں جب ایرانی جرنیل مارا گیا تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رومی جرنیل ''ہیراکلی یوس'' نے ایرانیوں پر شدید حملہ کر کے انہیں شکست دیدی۔

نمبر 2 ترکوں کا جوابی حملہ 588ء:۔

یہ ایک بڑا اور الجھی ہوئی جنگ تھی۔ 588ء میں ترکوں نے سرزمین ایران پر ہاتھ ڈالا اور خاقان ترکستان ''سادہ پادشاہ'' نے ایک لاکھ سوار لے کر بلغ کی جانب بڑھنا شروع کیا تا کہ ان علاقوں کو زیر کر کے وہ ایران کا رخ کرے۔

ہرمزد نے آذربائیجان کے گورنر بہرام چوبیں کو اس کے مقابلہ کے لئے ایک کثیر فوج کے ساتھ روانہ کیا روانگی سے پیشتر ہرفرد نے بہرام کو رستم کا جھنڈا یہ کہہ کر عطا کیا کہ رستم کی یہ یادگار تمہیں اس لئے دی جا رہی ہے تا کہ تم اس کے صحیح جانشیں ثابت ہو۔

بہرام انتہائی ضبط اور تنظیم کے ساتھ اپنا لشکر (جو بارہ ہزار تجرہ کار سپاہیوں اور وافر مقدار میں سامان جنگ سے آراستہ تھا) آگے بڑھا۔ سادہ شاہ نے اپنے بھائی فغور شاہ کی معرفت اس کے پاس پیغام بھیجا کہ ''ہم تک تمہاری مردانگی اور

حسن سیاست کی خبر پہنچی ہے ہم اس کی داد دیتے ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ اس قدر قیمتی جرنیل ایک فضول سی جھڑپ میں لقمہ تیغ بنے۔ اس لئے ہم اس وقت بھی تمہاری جاں بخشی کرتے ہیں اور تمہیں اپنے ہم مقربوں میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔اس لئے بہتر ہے کہ اس لشکر کو واپس جانے کا حکم دے کر ہماری عنایات اور اکرام سے مستفید ہو جاو۔

علاوہ ازیں اگر ہم ایران پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو تمام ایران کی حکمرانی تمہارے ہاتھ میں دے دی جائے گی۔''

مگر بہرام چوبیں نے اس پیشکش کو بڑی حقارت سے ٹھکرا دیا اور صاف الفاظ میں کہا۔''مجھے میرے بادشاہ نے یہ اعزاز بخشا ہے کہ میں تمہاری مقابلے میں آ کر تمہیں شکست دوں اور تمہارا سر کاٹ کر ان کی خدمت میں پیش کروں اور یہی میری دیانت داری ہو گی۔''

فغفور نے جب یہ جواب سنا تو سخت غصے میں آیا اور اسے بہرام کا تکبر قرار دیا اور اپنی فوج کو فوراً حملہ کرنے کا حکم دیدیا۔ترکوں کے پاس ایرانیوں کے مقابلہ میں فوج بھی زیادہ تھی اور اسلحہ بھی کثیر تعداد میں تھا۔اس سے ترکوں کو گھمنڈ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ جلد ایرانیوں کو زیر کر لیں گے۔

لیکن میدان جنگ میں یہ ہوا کہ ترک ایرانی قوت کا سامنا نہ کر سکے اور بہت جلد میدان چھوڑ کے بھاگ اٹھے۔ چنانچہ سادہ شاہ خود بھی راہ فرار اختیار کر گیا۔اس کے فرار ہوتے ہی بہرام چوبیں نے اس کی پشت پر ایسا تیر مارا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔بہرام نے فوراً آگے بڑھ کے سادہ شاہ کا سر کاٹ لیا۔اس کے

بعد جب ہو گیا۔ بہرام نے فوراً آگے بڑھ کے سادہ شاہ کا سر کاٹ لیا۔ اس کے بعد جب ترکوں کی فوج میدان میں لاتعداد لاشیں چھوڑ کر فرار ہوئی تو ان میں سادہ شاہ کے بھائی فغضور کی لاش بھی مل گئی۔

بہرام چوبیں نے اس کا سر بھی اتار لیا اور دونوں سروں کو ہرمز کے دربار میں بھیج دیا۔ اسی دوران بہرام چوبیں کو اطلاع ملی کے سادہ شاہ کا بیٹا جس کا نام ''پر موده'' تھا وہ بکیند (بخارا) میں پوشیدہ ہے پاس بہت سا فوجی سازو سامان ہے جس کے زور پر وہ کسی وقت بھی ایران پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اس وقت بہرم چوبیں نے ہرمز سے اجازت مانگی اگر حکم ہو تو ایرانی فوج کو ساتھ لے کر پر مودا کا تعقب کر کے اس کر کے اس کو بھی زیر کر کے فراغت حاصل کر لی جائے۔ چوبیں کو اجازت مل گئی چنانچہ وہ دریائے جیحوں عبور کر کے پر مودہ کے محل کے سامنے آ کر رکا۔ بہرام چوبیں نے شب خوں مار کے ترکستان کی فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔

پر مودہ ایک بلند خیمے میں موجود تھا۔ پر مودہ نے اس کو سمجھایا کہ جھگڑا کرنے کے بجائے بات چیت سے معاملہ طے کرو۔ بہرام کو بہت غصہ تھا اس نے کہا۔

''تم ایرانی انسان ہو کہ شیطان ترکوں کا اس قدر کشت و خون کر کے صبر نہیں آیا؟''

پر مودہ صلح پر راضی ہو گیا اور جنگ ختم ہو گئی۔ اس طرح بخارا پر ایرانیوں کا قبضہ ہو گیا۔

ثعالبی لکھتا ہے کہ ایرانیوں کو بخار کے قلعہ پر قبضے کے بعد اس علاقے سے

افراسیاب کے خزانے' سیاؤش کا تاج' کمر بند گوشوارے بھی ہاتھ لگے۔

طبری کا بیان ہے کہ سونا اور جواہرات اٹھانے کے لئے 256 اونٹوں کی ضرورت پڑی تھی۔ بہرام چوبیں نے یہ تمام مال و دولت ہرمز کے دربار میں بھیج دیئے۔

بہرام چوبیں کی بغاوت :۔

بہرام چوبیں نے ہرمز کے لئے جس جانفشانی سے کام لے کر ایرانی سلطنت کی توسیع اور اس کے دشمنوں کے قلع قمع کرنے میں مدد دی تھی وہ صحیح معنوں میں قابل تحسین اور قابل قدر تھی۔ گذشتہ واقعات اور سادہ شاہ کی پیشکش کو ٹھکرانے کے بعد اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک وفادار جرنیل کے کردار کا مالک تھا۔ لیکن اس کے کچھ حاسدوں نے اس کے بارے میں ہرمز کے کان بھرنا شروع کر دیئے۔ ہرمز کو ان باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بہرام اس کے لئے کس قدر محنت سے فرائض ادا کرتا ہے۔ آخر کہنے سننے سے زمین بھی اپنی جگہ چھوڑ دیتی ہے چنانچہ ایک حاسد برائی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے بادشاہ کے کانوں میں یہ خبر پہنچائی کہ برمودہ کو شکست دے کر بہرام نے بادشاہ کی خدمت میں بہت کم سامان بھیجا ہے اور اس نے زیادہ سامان اپنے پاس رکھ لیا ہے۔

ہرمز نے اس کی تحقیق کرنے کے لئے برمودہ جس کو اس نے بڑی عزت و احترام کے ساتھ ایران میں جگہ دے رکھی تھی' سے گفتگو کی۔ برمودہ نے اس کو بتایا

کہ میں اندازہ تو نہیں لگا سکتا کہ بہرام نے کچھ مال اپنے استعمال کے لئے رکھا ہے نہیں اتنی بات ضرور ہے کہ حضور کو جو مال پہنچا ہے میرے خیال میں کل سامان اس سے زیادہ تھا۔ ہرمز نے اس کا مطلب یہ نکالا کہ بہرام واقعی بے ایمانی کر گیا ہے چنانچہ اس نے بہرام کو ایک تہدید آمیز خط لکھا اور ساتھ ہی اسے شرمسار کرنے کے لئے عورتوں کا لباس روانہ کیا۔

بہرام کو خط اور عورتوں کا لباس ملا تو وہ بہت متعجب ہوا اور اسے غصہ بھی آیا کہ ایک اتنے ایماندار آدمی پر بادشاہ نے شک کر کے بدگمانی کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً ردعمل کے طور پر پرمودہ کے بیٹے خاقان سے گفتگو کر کے اس کے باپ کی سلطنت اس شرط پر اس کے حوالے کر دی کہ وہ بہرام کا ساتھ دے کر ہرمز کے مقابلے کے لئے اپنے آدمیوں کو روانہ ہونے کے لئے تیار کرے۔ اس کے اس نے اپنے زیر نگرانی تمام علاقے میں ہرمز کے بیٹے ''پرویز'' کے نام کے سکے جاری کر دیئے اس طرح پرویز کے دل میں حکمرانی کا جذبہ شدت سے بیدار ہو گیا اور وہ بادشاہ کو اپنے راستے سے ہٹانے کا خواہشمند ہو گیا۔

ادھر فوج کی امداد کے ساتھ خراساں کے علاقے میں آ کر واضح طور پر ہرمز کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اور ہرمز کو کہلا بھیجا کہ وہ فی الفور مستعفی ہو کر اپنی حکومت اپنے بیٹے پرویز کے حوالے کر دے۔ اس خبر کے پہنچنے پر ہرمز نے اپنے محبوب وزیر آذین گشب سے مشورہ کیا۔ اس نے ہرمز کو رائے دی کہ اس ہنگامے کو ختم کرنے کے لئے صرف ایک طریقہ یہ ہے کہ پرویز کو فوری طور پر قتل کرا دیا جائے۔ بعد ازاں ایرانی فوج کے ذریعہ بہرام چوبیں کی بغاوت کو فرو کرا دیا جائے

کیونکہ اس وقت اس بغاوت میں پرویز کے نام جاری شدہ سکے نے عوام کی حمایت کو پرویز کے حق میں کر دیا ہے۔

پرویز کا فرار اور قیصر روم کی پناہ:۔

آذین گشب کی تجویز کی خبر پرویز تک پہنچ گئی۔ پس پرویز راتوں رات بھاگ کر آذر بائیجان پہنچا اور وہاں سے بھاگ کر قیصر روم مارلیس کے پاس پہنچا۔ قیصر روم نے نہ صرف پرویز کو پناہ دی بلکہ اس کے ساتھ نہایت احسن سلوک روا رکھا۔ بعد ازاں "مارلیس نے اپنی ایک خوبصورت لڑکی مریم کی شادی پرویز سے کر دی اور جہیز میں دو سو کنیزیں دیں"۔

ہرمز کی موت:۔

جب ہرمز کو پرویز کے فرار ہونے کی خبر ملی تو وہ سخت پریشان ہوا۔ اس نے پرویز کے تعاقب میں ایک دستہ فوج کا روانہ کیا جو نا کام واپس ہوا۔ اسی اثنا میں خبر ملی کہ بہرام خراساں سے بڑھتا ہوا "رے" کے مقام تک آ پہنچا ہے۔ اس خبر سے لوگوں میں دہشت پھیل گئی۔ بہرام کا صرف ایک نعرہ باقی رہ گیا تھا کہ ہرمز کو تخت سے اتار کر اس کے بیٹے کو تخت نشیں کیا جائے۔

دوسری طرف کچھ لوگ ہرمز کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ ہرمز کو گرفتار کر کے اسے نہ صرف تخت سے محروم کر دیا بلکہ دوسرا ظلم یہ ہوا کہ اس کی آنکھیں بھی نکال دی گئیں۔

ہرمز نے گرفتار ہونے سے پہلے پرویز کے دو حامیوں ......''بندوی اور گستھم'' کو قید کر دیا تھا اور انہیں سخت سزا دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن ہرمز کے گرفتار ہو جانے کے بعد قید سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور دونوں ہی معزول بادشاہ ہرمز کے پاس پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے وہاں پہنچتے ہی ہرمز کو دبوچ لیا اور اس کا گلا گھونٹ دیا تھا اس طرح ہرمز کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

یہ واقعہ 590ء کا ہے۔

ہرمز نے ایران پر تقریباً انیس سال حکومت کی تھی۔

پرویز' ایران کی طرف :۔

اس دوران بہرام چوبیں بڑھتا ہوا مدائن تک جا پہنچا تھا اور وہاں پہنچ کر اس نے اپنی حکمرانی کا اعلان کرا دیا تھا۔

دوسری طرف پرویز' رومی افواج کی مدد سے آذربائیجان کے راستے بہرام سے جنگ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ بہرام چوبیں خود اس کے مقابلے میں آیا اور شکست کھا کر خراساں کی طرف فرار ہو گیا۔

پس ''پرویز'' نہایت کامیابی سے مدائن تک پہنچا اور اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ عوام نے بہرام کے فرار ہو جانے اور پرویز کو جائز حقدار سلطنت ہونے پر۔ ''پرویز'' کی حمایت کا اعلان کیا اور بڑی مسرت کا اظہار کیا۔

خسرو دوم (خسرو پرویز)

590ء تا 628ء

خسرو دوم اپنے باپ کی موت کے بعد 590ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا دوسرا نام ''خسرو پرویز'' بھی ہے۔ خسرو پرویز ساسانی دور کا سب سے آخری کامیاب ترین بادشاہ تھا۔ اسی کے زمانہ میں ساسانی حکومت پر ایسا زوال آیا کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد یہ خاندان ختم ہوگیا۔ خسرو کے عہد سلطنت میں مندرجہ ذیل واقعات رونما ہوئے تھے:

نمبر 1 بہرام چوبیں کا انجام
نمبر 2 رومیوں سے جنگ 613ء
نمبر 3 کالسی ڈون کی شکست 617ء
نمبر 4 رومی فوج کی ایران سے واپسی
نمبر 5 شہزوراز کی شکست 625ء
نمبر 6 قسطنطنیہ کا محاصرہ اور شاہین کی شکست
نمبر 7 حضرت نبی کریمؐ کا نامہء مبارک خسرو کے نام
نمبر 8 خسرو پرویز کا فرار
نمبر 9 خسرو کی گرفتاری اور موت

رومی فوج کی ایران سے واپسی:۔

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ خسرو پرویز اپنی جان بچانے کے لئے قیصر روم کے

پاس بھاگ گیا تھا اور اپنے باپ ہرمز کی وفات کے بعد رومی فوج کی مدد سے ایران حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ جب وہ مکمل طور پر حاکم ایران بن گیا اور اسے محسوس ہوا کہ اب وہ کافی مضبوط ہو گیا ہے تو اس نے رومی فوج کو ایران سے فارغ کرنا چاہا۔

مگر پیشتر اس کے کہ وہ اس فوج کو ایران سے فارغ کرتا وہ ان کا تشکر ادا کرنے کے لئے انہیں کچھ انعام واکرام بھی دینا چاہتا تھا۔

بہرام چوبیں کا انجام :۔

بہرام چوبیں خراساں سے فرار ہو کر ماوراالنہر چلا گیا۔ جہاں اس نے خاقان بن پرمودہ کے پاس پناہ لی۔ خاقان بن پرمودہ بھی پرویز ہی کے ماتحت تھا۔

پرویز نے خاقان کو خط لکھا:۔

''ہمارا ایک مجرم تمہارے پاس آیا ہوا ہے بہتر ہو گا کہ آپ اس کو ہمارے دربار میں پیش کر دیں تا کہ اس کو ہم اس کو مناسب سزا دے سکیں۔''

اس کے جواب میں خاقان نے پرویز جو جواب لکھا:۔

حضور مجھے افسوس ہے کہ میں بہرام کو پناہ دے چکا ہوں اب میں پناہ میں لئے جانے والے کو جان بوجھ کر نہیں مروا سکتا۔''

اس کے جواب میں اس نے اپنی فوج کی کمان اس کے ہاتھ میں دیدی۔

جب یہ خبر پرویز کو ملی تو وہ خائف ہوا کہ مبادا وہ لشکر کشی کر کے پھر ایران کی سرزمین کے امن کو خطرے میں ڈال دے۔ چنانچہ اس نے خاقان کے ساتھ منافقانہ رویہ اختیار کیا۔اس نے رومی فوج میں دو کروڑ درہم بطور انعام تقسیم کیے۔ سرداروں کو بیش بہا خلعتیں اور تحائف دیئے اور قیصر روم ''مارلیس'' کے لئے خصوصی تحائف دے کر رومی فوج کو ایران سے واپس کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ایران میں بسنے والے تمام نصرانیوں سے باج اور خراج لینا بند کر دیا۔اور انہیں سرزمین ایران پر مکمل مذہبی آزادی دیدی۔ چنانچہ ان نصرانیوں نے بڑی تیزی سے ایران میں گرجے اور دیگر عمارات کی تعمیر شروع کرادی۔

دوسری طرف خسرو نے تمام صوبوں کے گورنروں کو بھی ہدایات روانہ کر دیں کہ ملک کے تمام عیسائیوں سے حسن سلوک روا رکھا جائے اور جہاں تک ممکن ہو سکے ان لوگوں کی معروضات پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔

پرویز خائف ہوا کہ کہیں تعلقات خراب نہ ہو جائیں چنانچہ اس نے خاقان کے ساتھ منفقانہ بہتر تعلقات بنانے شروع کر دیئے اور اس کے ساتھ ہی ایک شخص مقرر کیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ''بہرام'' کو قتل کر دے۔ چنانچہ اس شخص نے بھیس بدل کر اپنا فرض ادا کیا اور ایک روز جب بہرام اپنے فوجی کیمپ میں آرام کر ایک تاجر کی حیثیت سے بہرام کو تحائف پیش کرنے کے بہانے کیمپ میں داخل ہوا اور ان تحائف کی خوبیاں بیان کرتا ہوا بہرام کے بالکل قریب پہنچ گیا پھر اس نے پرویز کو خوش کرنے کے لئے زہر آلود خنجر اس کے سینے میں اتار دیا۔اس طرح ایک

نہایت وفادار ایرانی' بے باک بہادر اور جانباز جنرل نہایت مایوسی کے عالم میں ختم ہو گیا۔

رومیوں سے جنگ 613ء:۔

اس طرح 613ء میں قیصر روم ''ماریس'' جس نے پرویز کو نہ صرف پناہ دی۔ جسے اپنی بیٹی دی بلکہ ایرانی سلطنت کو مستحکم کرنے کے لئے رومی لشکر تک دیا۔ وہ ایک رومی جنرل فوکس کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ رومیوں نے اس کا بہت برا منایا۔ پورے روم میں گڑ بڑ گڑ بڑ مچ گئی۔ بہت سے جرنیل خود نئے قیصر روم ''فوکس'' کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ''پرویز'' نے ایک جامع فوج لے کر رومی سرحدوں پر دھاوا بول دیا اور قلعہ ''دارا'' کو فی الفور اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ آگے بڑھا اور بڑی تیزی سے الرہا۔ انطاکیہ اور دمشق کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

یروشلم کی فتح:۔

دمشق فتح کرنے کے بعد پرویز نے ''یروشلم'' کو تسخیر کیا اور وہاں سے حضرت عیسیٰ کی مقدس صلیب طسیفون بھیج دی۔ عیسائیوں کو صلیب' جان سے زیادہ عزیز اور عصمت سے زیادہ محترم تھی۔ صلیب کے ہٹائے جانے سے نہ صرف ان کے دلوں کو صدمہ پہنچا بلکہ یہ ان کے وقار کے منہ پر ایک زبردست تھپڑ تھا۔
ان فتوحات کے علاوہ ایرانیوں نے مصر کے مشہور ترین تجارتی مرکز

''اسکندریہ'' پر قبضہ کرنے کے بعد ایک ایرانی جنرل ''شاہین'' نے کچھ فوج کے ساتھ 617ء میں کالسی دون پر حملہ کرکے اس پر قبضہ جمالیا۔ یہ شہر قسطنطنیہ کے بالکل قریب تھا۔ اس کے بعد ہی ''ہراقلیس'' جسے ''ہرقل'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ ''مسند قیصر روم'' پر جلوہ افروز ہوا۔

ہرقل نے ایرانی جنرل شاہین سے ملاقات کا بندوبست کرایا اور دونوں اکابرین نے طویل گفتگو کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ:۔

ہرقل جنگ بندی کرنے یا پیش قدمی روکنے کے لئے شہنشاہ ایران کے دربار میں سفیر بھیجے۔ جو حکم بادشاہ کی طرف سے ملے اس کی تعمیل کی جائے۔ تاہم اس وقت تک جنگ روک دی جائے۔

رومی سفیر دربار پرویز میں:۔

رومی سفیر جب پرویز کے بارے میں حاضر ہوئے تو اس نے سفیروں کو گرفتار کرکے قید میں ڈال دیا اور شاہین کو حکم بھیجا کہ فوری طور پر ہرقل کا سر کاٹ کر دربار میں حاضر ہو جائے۔ اگر وہ اس حکم کی تعمیل میں ناکام رہا تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ یہ کٹر کسی طرح ہرقل تک بھی پہنچ گئی چنانچہ وہ اپنی فوج کے ساتھ اپنے بحری بیڑے میں سوار ہو کر فوراً قسطنطنیہ کی طرف فرار ہو گیا۔ اس طرح پرویز کے حکم کی تعمیل نہ ہو سکی۔

شہر دراز کی شکست:۔

کالسی ڈون سے بھاگ کر ہرقل آرمینیہ کی سرحت ایک شہر ''ایس'' پہنچا۔ ایس کے علاقے پر حاکم شہر وراز کو پہلے ہی حکم پہنچ چکا تھا کہ وہ رومی فوج کا مقابلہ کرے۔ چنانچہ رومی فوج اور شہر وراز کا وہاں سخت مقابلہ ہوا۔ بدقسمتی سے شہر وراز کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور ہرقل بڑے فاتحانہ انداز میں پھر قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اگلے سال یعنی 623ء میں ہرقل نے اپنے بحری بیڑے کی مدد سے لازیکا پر حملہ کر دیا اور لازیکا کو زیر کرتا ہوا آرمینیہ کی طرف بڑھنے لگا۔ خسرو پرویز کو جب اس حملہ کا پتہ چلا تو وہ چالیس ہزار سواروں اور پیادہ فوج پر مشتمل فوج لے کر مقابلے کے لئے آیا۔ لیکن ہرقل نے اس قدر رجم کے حملہ کیا کہ خسرو کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ چنانچہ رومی فوج نے آرمینیہ کے بہت سے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جو شہر بھی ان کے راستے میں آیا اسے جلاتے اور آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ جس طرح ایرانیوں نے رومیوں سے 613ء والی جنگ میں عیسائیوں کی بے حرمتی کرتے ہوئے حضرت عیسٰی والی صلیب اٹھا کر طیفون لے گئے تھے اسی طرح رومیوں نے ''زرتشت'' کی جائے پیدائش ''ارومیا'' کو بھی جلا کر خاک کر دیا اور یہاں پر کئی صدیوں قدیم مقدس آگ کو بھی بجھا دیا۔

پھر 624ء میں پرویز نے چاہا کہ وہ رومیوں پر ایک مرتبہ پھر حملہ کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اس نے ایک کثیر فوج کے رومیوں کے مقابلہ کے لئے روانہ کی۔ اس فوج کا سامنا کرنے کے لئے ہرقل پھر میدان میں آیا۔ سب سے پہلا اس کا مقابلہ شہر وراز کی ہی فوج سے ہوا۔ ہرقل کا حملہ کچھ اس قدر تیز قسم کا تھا

کہ ایرانی فوج مقابلہ میں نہ ٹھہر سکی۔ شہر دراز خود شکست کھا کر فرار ہو گیا اور فرات سے اس پار ایک شہر سارس میں جا کر مقیم ہو گیا۔ ہرقل نے اس دوران ارزانین اور عمیدہ پر قبضہ کر لیا۔

625ء میں ہرقل نے دریائے فرات کو عبور کر لیا اور شہر دراز کے تعاقب میں شہر سارس تک جا پہنچا شہر دراز یہ خبر سن کر وہاں سے بھی بھاگ اٹھا۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ اور شاہین کی موت :۔

626ء میں خسرو نے چاہا کہ اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو واپس حاصل کرے۔ چنانچہ اس نے ایک زبردست فوج اس مقصد کے لئے روانہ کی۔ ادھر قیصر روم نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا ایک حصہ کی کمان خود سنبھالی اور دوسرا حصہ فوج پر اپنے بھائی ''تھیوڈورز'' کے حوالے کر دیا اور اسی ہی کو ایرانی فوج کے مقابلے کے لئے مقرر کیا۔ وہ خود لازیکا کی فوج پر حملے کے لئے روانہ ہوا۔ پرویز نے سوچا تھا کہ اس مرتبہ وہ روم کو بری طرح شکست دے گا لیکن اس کے تمام منصوبے بالکل ناکام ہو گئے اور پرویز کی فوج بری طرح شکست ہوئی۔ اس فوج کی کمان بادشاہ کے علاوہ اس کا جرنیل ''شاہین'' بھی کر رہا تھا۔ چنانچہ پرویز منہ کی کھا کر واپس پایہ تخت مدائن آیا اور شاہین کو بلوا کر قتل کرا دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک خسرو پرویز کے نام :۔

اسی اثنا میں سرزمین عرب میں ایک خورشید درخشاں طلوع ہو چکا تھا جس

نے تمام دنیا کے ظلمت کدوں کو نور سے بھرنا شروع کر دیا تھا۔اس کی کرنیں سر زمین ایران پر بھی پڑنا شروع ہوگئی تھیں۔یہ خورشید تاباں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کا ظہور پرنور تھا۔جنہوں نے جہالت' گمراہی اور باہمی فسادات کی تاریکیوں کو دور کر کے صراط مستقیم کے راستوں کو ہموار کر دیا تھا۔ چنانچہ اس مقصد عظیم کو عام کرنے کے لئے جناب رسول مقبول نے مختلف سر براہاں ممالک کو دعوت اسلام کے لئے خطوط تحریر فرمائے تھے۔ان ممالک میں قیصر روم' نجاشی حبشہ اور کسریٰ ایران وغیرہ شامل تھے۔چنانچہ حضور پاک نے کسریٰ کے نام جو گرامی نامہ تحریر فرمایا۔اس کا متن اور ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"بسم الله الرحمعن الرحيم"

من محمد رسول الله الیٰ کسریٰ عظیم فارس

سلام علی من اتبع الهدا وامن باالله

ورسول واشهدان لا اله الله و

ان محمد اعبده 'رسوله وانی

رسو الله الناس کانته

لا نذر من کانا حیاو تجس القول علی الکافرین

فاسم. تسلیم"

ترجمہ۔بنام خدائے بخشندہ ومہربان

اللہ کے رسول (جناب) محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم کی طرف سے ایران کے

عظیم کسریٰ کے نام

☆ سلام ہو ان لوگوں پر جو ہدایت کے راستے پر چلے اور جو اللہ اور اس
کے رسول پر
ایمان لائے۔

☆ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔

☆ اور بے شک حضرت (محمد رسول اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندہ اور رسول
ہے۔

☆ اور بے شک میں تمام انسانوں کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا
ہوں۔

☆ تا کہ میں ہر زندہ شخص کو (یہ حقیقت بیان کر کے) ڈراؤں کہ کافروں
کے متعلق
خدا کی تمام باتیں پوری ہو کر رہیں گی۔

☆ کہ جس شخص نے اسلام قبول کر لیا پس وہ (سلامیت کے دائے) میں
آگیا۔

☆ اگر تم نے انکار کیا تو (یاد رکھو) تمام مجوسیوں کا گناہ تمہارے ہی ذمہ ہو
گا۔

خسرو پرویز کے دربار میں یہ نامہ مبارک ایک مشہور صحابی عبداللہ بن
حزافہ نے
پیش کیا۔

جب خسرو پرویز نے اس نامہ مبارک کو پڑھا تو سخت غضبناک ہوا اور غصے

میں آ کر اس نامہ مبارک کو دربار ہی میں پارہ پارہ کر دیا۔ اور یمن کے بادشاہ "باذان" کو ایک حکم نامہ تحریر کرایا اور دو آدمیوں کو مامور کیا (اس کام کے لئے) کہ جناب رسول اکرم کو دربار میں لایا جائے۔

کہتے ہیں کہ یمن کے بادشاہ نے ابھی دو آدمیوں کو اس کام کے لئے مامور کیا ہی تھا کہ اس کو خبر ملی کے پرویز کو تخت سے اتار دیا گیا ہے اور اس کا بیٹا قباد تخت نشیں ہو گیا ہے۔ قباد نے تخت پر بیٹھتے ہی یمن کے بادشاہ کو لکھا کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حکم واپس لیا جاتا ہے اور اس قسم کی گستاخی کرنے کی جرأت نہ کی جائے۔ ادھر عبداللہ بن حزافہ جب واپس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور یہ خبر بتائی تو حضور نے فی الفور ارشاد فرمایا:

"کہ بہت جلد ہی سلطنت ایران ٹکڑے ٹکڑے ہونے والی ہے اور ساسانی خاندان کا خاتمہ بالکل قریب آ چکا ہے" چنانچہ یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی اور خسرو کے بعد ہی ساسانی سلطنت نہ صرف رو بہ انحاطاط ہوئی بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

"خسرو پرویز کا فرار، ۔ 12 دسمبر 627ء"

ایرانی فوج کی پے در پے شکستوں کے بعد ہرقل کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ چنانچہ اس نے ایرانی شہر "دست جرد" طیسفون سے ستر میل کے فاصلے پر واقع ہے اور خسرو موسم خزاں وہاں ہی گزارہ کرتا تھا۔ ایرانی فوج اس کے مقابلہ کے لئے "گنزگ" سے تھوڑی دور آ گئے "نینوا" کے مقام پر رومی فوج سے جا ٹکرائی۔ نینوا کے

مقام پر دونوں لشکروں کے درمیان ایک گھمسان کا رن پڑا۔ وہاں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ آخر ایرانی جرنیل اس جنگ میں مارا گیا۔ اور شکست خوردہ فوج قلعہ بند ہو گئی۔ ہرقل نے پیش قدمی جاری رکھی۔ یہ پیش قدمی اس قدر تیز تھی کہ پرویز اس کا مقابلہ نہ کر سکا اور مایوس ہو کر بھاگ نکلا۔

خسرو پرویز کی گرفتاری اور موت:۔

خسرو پرویز کی پے در پے شکستوں اور جرنیلوں کو قتل کرا دینے کی بنا پر امرا اور عوام میں سخت بد دلی پیدا ہو گئی اور انہوں نے خسرو پرویز کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کیا۔ خسرو پرویز کو اس سازش کا علم ہوا تو تخت چھوڑ کر فرار ہونے لگا مگر گرفتار ہوا اور قید میں ڈال دیا گیا۔ خسرو کو صرف پندرہ دن تک قید میں رکھا گیا پھر اسے کال کوٹھری سے نکال کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

یہ وہی خسرو پرویز تھا جس نے سلطنت ایران کو اتنا وسیع کر دیا تھا جس کی مثال نہیں ملتی۔ آخر میں وہ اس قدر ذلت کی موت مرا جس پر حسرت بھی آنسو بہاتی ہے۔

خسرو پرویز کا کردار اور چند امور:۔

خسرو پرویز ایک خوبصورت اور بہادر بادشاہ تھا۔ اس نے سلطنت ایران کو ہنحامنشی حدود کے برابر کر دیا۔ لیکن اس کا آخری دور بے حد تاریک ہوا۔ بہت سے علاقے ہاتھ سے نکل گئے اور ساسانی خاندان ہی زوال پذیر ہو گیا۔

خسرو پرویز کے عجائبات:۔

نمبر 1 قصر طیفون

نمبر 2 مشہور گھوڑا شبدیز

نمبر 3 سفید ہاتھی

نمبر 4 درفش کاویانی

نمبر 5 سرکش درباری گویے

نمبر 6 شریں۔ یہ وہی شیریں ہے جس پر فرہاد عاشق ہوا تھا

نمبر 7 خش آرزو غلام۔ خوشبویات کا ماہر۔

خسرو پرویز کے مشہور خزانے:۔

نمبر 1 گنج باد آورد

نمبر 2 گنج گاد

نمبر 3 گندعروس

نمبر 4 گنج خضراء

نمبر 5 گنج سوختہ

نمبر 6 گنج حسروی

نمبر 7 گنج شاد آورد

نمبر 8 گنج افراسیاب

نمبر 9 زمرد اور یاقوت کے مہروں والی شطرنج

نمبر 10 دو سو مثقال سونے کا ایک ٹکڑا جو موم کی طرح نرم تھا۔

نمبر 11 ایک رومال جس پر سے ہر طرح کا داغ خود بخود غائب ہو جاتا تھا

نمبر 12 ایک من بیس سیر سونے کے وزن کا تاج جس کے جواہرات رات میں جھلملاتے تھے۔

نمبر 13 دیبا اور زربفت کے چار قالین جو ہیروں سے مرصع تھے اور چاروں موسموں کی کیفیات ظاہر کرتے تھے۔

نمبر 14 تخت تکدیس۔ ساگواں اور ہاتھی دانت سے تیار کیا گیا فرش تھا۔ یہ سات گز اونچا تھا۔ مگر اس عظیم بادشاہ کا انجام بخیر نہ ہوا۔

خسرو پرویز نے ایران پر تقریباً (38) سال حکومت کی۔

شیرویہ۔ قباد دوم

خسرو پرویز کی ہلاکت کے بعد اس کا بیٹا قباد دوم جسے شیرویہ کے نام سے بھی پکارتے تھے وہ تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں مندرجہ ذیل واقعات پیش آئے۔

نمبر 1 بھائیوں کا قتل

نمبر 2 رومیوں سے صلح اور صلیب کی واپسی

نمبر 3 شیریں کی موت

بھائیوں کا قتل

تخت پر بیٹھتے ہی اسے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کی سلطنت کے بہت سے دعویدار ہیں۔ یہ دعویدار اس کے بھائی ہی تھے۔ چنانچہ اس نے ان دعویداروں کو ایک ایک کر کے قتل کرانا شروع کرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آغاز سلطنت ہی سے اس کی رعایا اس کی مخالف ہو گئی۔

صلیب کی واپسی:۔

اس نے رومیوں کے ساتھ اس شرط پر صلح کر لی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صلیب جو اس کے باپ خسرو پرویز نے یروشلم سے اٹھوا کر طسیفون بھجوا دی تھی وہ رومیوں کو واپس کر دی جائے گی۔ رومی اس شرط کو مان گئے اور ایران سے حضرت عیسیٰؑ کی صلیب کو لے جا کر پھر یروشلم میں نصب کر دیا گیا۔

شیریں کی موت:۔

قباد دوم قیصر روم ماریس کی بیٹی مریم کے بطن پیدا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی خسرو نے ایک اور حسینہ جس کا نام شیریں تھا' سے خفیہ طور پر شادی کر رکھی تھی۔ اس سلسلے میں ثعالبی کا بیان ہے کہ خسرو نے شیریں کو بھی ملکہ کا درجہ دے رکھا تھا۔ خسرو پرویز کی ہلاکت کے بعد جب شیریں بیوہ ہو گئی تو قباد نے شیریں کو مجبور کیا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کر لے۔

اس سلسلے میں شیریں نے دو شرطیں پیش کیں:

نمبر 1 اس کا اور اس کی اولاد کا سارا سامان اسے لوٹا دیا جائے۔

نمبر 2 شادی کی رسم کی ادائیگی سے پہلے اسے (شیریں) کو پرویز کی قبر پر جانے کی اجازت دی جائے۔

قباد نے ان باتوں کو تسلیم کر لیا اور شیریں کا اور اس کی اولاد کا پورا سامان اسے لوٹا دیا۔ شیریں نے وہ تمام سازو سامان اور مال دولت مفلسوں' کنیزوں اور عبادت گاہوں میں کلی طور پر تقسیم کرا دیا۔ اس کے بعد وہ خود ایک نہایت خوبصورت اور دلاویز لباس پہن کر پرویز کی قبر پر گئی۔ جانے سے پہلے اس نے اپنی انگوٹھی میں موثر زہر بھر لیا پھر اس نے قبر پر بیٹھ کے اس زہر کو نگل لیا۔ وہ زہر اس قدر زود اثر تھا کہ اسے پیتے ہی شیریں کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کی موت کی خبر جب قباد کو ملی تو وہ بہت افسردہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ شرمندہ بھی تھا۔

پھر 629ء میں ایران میں طاعون کی وبا پھیلی۔ اس کا شکار پہلے خود بادشاہ ہوا اس کے ایک سال بعد (ایک دوسرے بیان کے مطابق) صرف چند دن بعد بادشاہ بھی مر گیا۔

اردشیر سوم:۔

اردشیرم سوم کو ایرانی جرنیل نے تخت سے ہٹا دیا تھا لیکن وہ اس کوشش میں خود ہی مارا گیا۔ پھر خسرو سوم تخت نشیں ہوا مگر وہ بھی قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد

جواں شیر 629ء

پوران دخت 629ء سے 631ء تک

گشتاسپد 631ء

آذی رخت 631ء

پھر ہرمز پنجم

خسرو چہارم

فیروز دوم

خسرو پنجم

یزدگر دسوم

کئی چھوٹے بڑے بادشاہ تخت نشیں ہوئے یہاں تک کہ 652ء میں یزدگی کا قتل ہوا اس کے ساتھ ہی ایران سے ساسانی خاندان کی حکومت ختم ہوگئی۔ ان کی حکومت چار سو چھبیس سال تک قائم رہی۔

قارئین کرام!

میں قلم کار اور آپ قاری ہیں۔ میرا اور آپ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آپ کی فرمائش سر آنکھوں پر۔ آپ نے ''شجرۃ العروس'' کے رومان کی دوبارہ اشاعت کی فرمائش کی ہے پس میں اس ناول میں اس رومان کو شام اشاعت کر رہا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میرے ایک بیس سال پرانے رومان واقعی اس قدر عظیم رومان ہے کہ ناول روک کر اس رومان کو شامل اشاعت کر رہا ہوں۔ یہ رومان 1255ء کا ہے۔

اس کا عنوان ہے:۔

"شجرہ العروس"

قبر کے سرہانے لہلہاتا ہوا یہ درخت جو صدیوں سے دیکھنے والوں کو لازوال محبت اور وفا کی کہانی سناتا آرہا ہے۔

...........☆...........

عتبہ بن حباب کی نظریں آخر بہک گئیں۔ عتبہ بڑا پارسا جوان تھا۔ پاک دل، پاک نظر لیکن وہ کھنکتے ہوئے نقرئی قہقہوں کی تاب نہ لا سکا۔ اس کی نظریں بہکیں اور دروازے کا طواف کرنے لگیں۔ ایک گروہ حسیناں، دروازے پر اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ چھ شاداب جوانیوں کا یہ جھنڈ اور دوسری طرف ایک چشم آہو دروازے کے پٹ سے لگی کھڑی تھی۔ وہ عتبہ کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔ شہابی رنگت، کتابی چہرہ، شعاعیں بکھیرتی، جگمگاتی آنکھیں ایسی نہ تھیں کہ عتبہ متاثر ہوئے بغیر رہ جاتا۔ جوانی کے فطری جذبات کا دھارا عتبہ کی پارسائی کو بہالے گیا۔

عتبہ کی زبان سے بیساختہ

"سبحان اللہ"

نکلا۔ پہلے تو یہ چاند ستارے، اشاروں کی آنکھ مچولی کھیلتے رہے پھر ان میں کانا پھوسی ہوئی اور پھر ان میں سے ایک بت طناز اٹھلاتی ہوئی صحن مسجد میں داخل ہوئی۔ یہ مسجد احزاب۔ مدینہ کی ایک معروف مسجد۔ اسے غزوۂ خندق کی یادگار

کے طور پر ایک خندق کے کنارے تعمیر کیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ مسجد زیارت گاہ بن گئی۔ مدینہ آنے والے اس مسجد کی زیارت کو باعث برکت سمجھتے تھے۔ اس مسجد کے صحن میں عتبہ بیٹھا تھا۔

وہ سکون دل کے لیے آیا تھا مگر اضطراب سے دوچار ہو گیا۔ پہلی نظر ہی میں حسن توبہ شکن کے دربار میں نقد دل کا نذرانہ پیش کر دیا۔ لوگ مجاز میں حقیقت تلاش کرتے ہیں لیکن عتبہ مجاز کی تابنا کیوں میں کھو کر رہ گیا۔

آنے والی دوشیزہ قدم قدم پر فتنے جگاتی' عتبہ کے سر پر پہنچ گئی...... عتبہ کو خبر بھی نہ ہوئی۔ اس کی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔ وہ دوشیزہ پہلے تو عتبہ کی محویت کو دلچسپی سے دیکھتی رہی پھر شاید اس کی انا کو ٹھیس لگی۔

وہ کڑک کے بولی۔

''رے جناب ادھر کیا دیکھ رہے ہیں۔''

عتبہ چونک پڑا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ حلق خشک ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر آواز نہ نکلی۔

دوشیزہ اس کی بوکھلاہٹ پر ہنس پڑی۔ گویا گلستان کھل گیا۔

اس نے نرم لہجے میں پوچھا:

''اگر کوئی آپ کے دیدار کی تمنا کرے تو آپ کیا خیال کریں گے؟''

سوال مبہم اور غیر متوقعہ تھا۔ عتبہ کی گھبراہٹ میں اور اضافہ ہو گیا۔ جواب تو اس سے نہ بن پڑا لیکن نظریں ایک بار پھر دروازے سے لپٹی ہوئی حسینہ کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔

سوال کرنے والی لڑکی بولی:

''اگر یہ سوال اس کی طرف سے ہو جسے آپ دیکھ رہے ہیں تو؟''

جواب کون دیتا۔ عتبہ تو حسن کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ اس پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔

اور جب عتبہ کو ہوش آیا تو حسینوں کا یہ غول 'شوخیوں کے موتی لٹاتا' مسجد سے بہت دور جا چکا تھا۔

وہ دوڑ کے دروازے پر آیا اور چاہا کہ لڑکیوں کا تعاقب کرے لیکن شرافت نے دامن پکڑ لیا۔ عتبہ بن حباب بن منذر بن صبوح کا تعلق' گروہ انسار کے ایک اعلیٰ ظرف گھرانے سے تھا۔ اب پچھتایا کہ کیوں نہ پیامبر کے سوال کا جواب دیا۔ اس جان آفریں کا نام و پتہ کیوں نہ پوچھا۔

وہ عید کا دن تھا اور اوائل اسلام کا زمانہ.......عربوں کا دستور تھا کہ عید کے دن عرب کے بانکے سجیلے جوان زرق و برق لباس پہنتے' خواتین اور دوشیزائیں کنگھی کرتیں پھر جوان اور دوشیزائیں نزہت گاہوں اور مرغزاروں کا رخ کرتیں۔ عزیز و اقارب سے ملاقاتیں ہوتیں۔ اس بہانے دید و شنید دونوں ہو جاتیں۔

عتبہ لڑکھڑاتے قدموں سے گھر جا رہا تھا ایک تو خیالات کا ہجوم دوسرے گلی کوچوں میں بھیڑ بھاڑ۔ کھوئے سے کھویا چھلتا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے گھر پہنچا۔ بہنیں اپنی سکھی سہیلیوں سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ چھوٹا بھائی باہر کھیل رہا تھا۔ گھر میں بوڑھی ماں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ ماں عتبہ کی طبیعت سے واقف تھی کہ عتبہ آرام

بیزار ہے۔وہ کمرے میں آ کر پڑ رہا۔ماں نے کوئی توجہ نہ دی۔

دن کا باقی حصہ اور وہ رات عتبہ نے بڑے کرب سے کاٹی۔جیسے انگاروں پر لوٹ رہا ہو۔کبھی اٹھتا، کبھی بیٹھتا اور اور کبھی اٹھ کے ٹہلنے لگتا۔اس نے رات کا کھانا بھی نہ کھایا۔بھوک پیاس تو جیسے اڑ گئی تھی۔

صبح ہوتے ہی اس نے مسجد کا رخ کیا۔مسجد احزاب اسے کوئے جاناں نظر آنے لگی۔وہ مسجد پہنچا اور برآمدے میں اس جگہ اس طرح بیٹھ گیا جیسے شکاری شست باندھ کر بیٹھتے ہیں۔

یہ عید کا دن تھا۔زیارت کو آنے والوں کی کل جیسے بھیڑ بھاڑ نہ تھی۔مرد،عورتیں اور بچے آگے پیچھے آ رہے تھے۔عتبہ کی نظریں آنے والوں پر پڑتیں اور مایوس لوٹ جاتیں۔صبح سے دوپہر پھر شام ہونے کو آئی مگر آنے والی نہ آئی۔اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔غریب کا ہاتھ اپنے گریبان پر۔وہ بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔کبھی دل کہتا کہ گھر کو چل۔کیوں انتظار کر رہا ہے۔کسی نے آنے کا وعدہ تو کیا نہیں۔پھر وہ غصہ کیسا؟

عتبہ نے کئی بار واپسی کا ارادہ کیا لیکن اک امید مدہو کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔یہ سوچ کر اٹھتا پھر بیٹھ جاتا کہ کیا عجب وہ یا اس کی سہیلی ادھر آ نکلے۔آخر اتفاق بھی تو کوئی چیز ہے۔دل کو تسلیاں دیتے دیتے شام ڈھلنے لگی۔اس کی بے کلی بڑھ گئی۔پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ جس دربار سے منہ موڑ اتھا اسی دربار میں دعا کے لئے ہاتھ بلند کر دیئے۔

”اے خدایا۔میری خطا معاف کر تو غفور الرحیم ہے۔سب کی سنتا ہے۔میری

بھی سن۔ مجھے بھی منزل کا راستہ دکھا۔"

وہ واقعیہ سب کی سنتا ہے۔کوئی کتنا ہی اس سے منہ موڑے مگر وہ منہ نہیں موڑتا۔عتبہ کے ہاتھ بلند تھے اور آنکھیں بند۔اس نے دعا کے بعد ہاتھ منہ پر پھیر کر آنکھیں کھولیں۔ٹھیک اس وقت کچھ عورتیں اور لڑکیاں مسجد میں داخل ہوئیں عتبہ کی آنکھیں ان کے درمیان اپنی "جان بہار" کو تلاش کرنے لگیں۔

اس کی دعا قبول ہو چکی تھی۔

وہ تو نظر نہ آئی مگر اس کی پیامبر لڑکی ان عورتوں کے گروہ میں شامل تھی۔عتبہ کا دل دھڑکنے لگا۔چاہا کہ دوڑ کے اس سے پوچھے لیکن عقل نے قدم پکڑ لئے۔

"یہ کیا وحشت ہے عورتیں سر ہو گئیں تو جان چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔عتبہ کی نظریں لڑکی کا تعقب کرتی رہیں۔ایک بار چور نظروں سے لڑکی نے عتبہ کو دیکھا۔عتبہ کو امید کی کرن نظر آئی۔اس نے بھی جواب میں لڑکی کو یوں دیکھا جیسے وہ اس کا منتظر ہو۔

تھوڑی دیر بعد اپنی ساتھیوں کی نظر بچا کر عتبہ کے پاس آ گئی۔

عتبہ ہمہ تن انتظار تھا۔

لڑکی نے گذشتہ روز والا سوال دہرایا۔

"اے جناب اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔"

"لیکن......لیکن وہ ہے کہاں"عتبہ نے لڑکھڑائی زبان میں پوچھا۔

"سوال کا جواب دیجئے جناب"لڑکی نے جواب پر اصرار کیا۔

عتبہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ بولا۔

''مجھے انتظار ہے۔ میں بھی ملنا چاہتا ہوں اس سے''

لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

''تو بس اب انتظار کرتے رہئے مہربان۔ یہ جواب کل دیا ہوتا تو ملاقات ممکن تھی۔ ریا واپس چلی گئی۔''

''کیا نام بتایا آپ نے؟''

''ریا بنت منظر ین سلمی۔''

''ریا کہاں چلی گئی؟'' عتبہ اور زیادہ بے چین ہوا۔

''سادہ۔ اپنے گھر.......مدینہ کی زیارت کو آئی تھی۔'' لڑکی نے جلدی جلدی بتایا۔ اس کے ساتھ والی عورتیں ادھر ہی آ رہی تھیں۔

''سادہ.......کہاں ہے؟ کچھ اور اتہ پتہ۔ کس خاندان کی ہے؟'' عتبہ نے پوچھا۔

''عجیب آدمی ہیں آپ۔ سب کچھ تو بتا دیا میں نے۔ جا کر ڈھونڈ لیجئے۔ لڑکی گھبرا رہی تھی کیونکہ اس کی ساتھی عورتیں دروازے کی طرف واپس جا رہی تھیں۔

''خاندان تو بتا دیجئے۔'' عتبہ نے التجا کی۔

''انصاریوں میں سے ہے''۔ لڑکی نے جواب دیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

عتبہ جلدی سے اٹھ کے پیچھے ہولیا۔

''کیا غضب کر رہے ہیں آپ کسی نے دیکھ لیا تو میری خیر نہیں''۔ لڑکی پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

عتبہ نے روکتے ہوئے سوال کیا۔

''اچھا یہ تو بتا دیجئے کہ اسے بھی میرا خیال ہے کہ نہیں؟''

''بالکل اناڑی ہیں آپ''۔ لڑکی نے تمسخر کیا ارو تیز قدم اٹھاتی اپنی ساتھیوں کے پاس پہنچ گئی۔

عتبہ کچھ دیر صحن مسجد میں کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر مضمحل قدموں سے اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ ریا بنت فطریق سلمی۔ سادہ۔ انصاری خاندان' نام پتہ اور خاندان کو کئی بار دہرا کر عتبہ نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا۔

سب سے پہلے اسے ''سادہ'' کا پتہ لگانا تھا۔ یہ نام اس کے لئے بالکل نیا تھا۔ پتہ نہیں یہ کوئی گاؤں ہے کہ شہر۔ کس سے پوچھے۔ یہ بھی ایک مسئلہ تھا اس کے لئے ماں اسے مردم بیزار سمجھتی تھی۔ اس میں بڑی حد تک حقیقت بھی تھی۔ اس دور میں عرب کے جوانوں میں شعر و شاعری اور عشق و عاشقی کا عام رواج تھا۔ عاشق کھلے عام اپنے عشق کی داستانیں منظوم کرتے اور احباب میں بیٹھ کے بے جھجک سناتے تھے۔ یہ داستانیں حقیقی بھی ہوتیں اور فرضی بھی۔

عتبہ خاموش طبیعت اور گوشہ نشیں قسم کا انسان تھا۔ وہ ان باتوں کو وقت کا زیاں سمجھتا تھا پھر بھلا اس زمانے کے جوان' عتبہ کو اپنا دوست کیوں بناتے۔ ایک ایک کر کے سب جوانوں اسے الگ تھلگ کر دیا تھا۔ اب عتبہ کے دل پر چوٹ پڑی تو اسے کسی ہمدرد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دوست اور دوستی کی قدر معلوم

ہوئی۔اس نے ان تمام دوستوں کے بارے میں سوچا جو اسے جوانی کے ہنگاموں کی دعوت دیتے تھے اور اس کے خشک رویئے سے بیزار ہو کر اسے فراموش کر چکے تھے۔ہاشم کے سوا عتبہ کو اور کوئی نظر نہ آیا۔

مکتب کی تعلیم کے دوران عتبہ اور ہاشم میں گہری چھنتی تھی۔بچپن کے کھیلوں اور شرارتوں میں دونوں بھر پور حصہ لیتے تھے لیکن جوانی کی آمد کے ساتھ اس کی طبیعت میں تغیر پیدا ہوا اور وہ خوشیوں سے الگ تھلگ رہنے لگا۔اس میں قدرے خود پسندی پیدا ہوگئی' اور وہ خود کو دوسروں سے افضل سمجھنے لگا۔اس کے دوست یہ سمجھ بیٹھے کہ عتبہ پر مذہب کا گہرا رنگ چڑھ گیا ہے اس لئے وہ جوانی کی شوخیوں سے گریز کرتا ہے۔طبیعتوں کے اس اختلاف کے باوجود ہاشم نے عتبہ سے راہ و رسم کا سلسلہ قائم رکھا۔وہ کبھی کبھی عتبہ کے گھر چلا جاتا۔عتبہ بھی سال میں ایک دو بار اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔

وہ رات بھی عتبہ نے بڑی بے چینی سے کاٹی۔اسے اس وقت مدد کی ضرورت تھی۔اسے امید تھی کہ ہاشم اس کا ساتھ ضرور دے گا۔وہ ہاشم پر اعتبار کر سکتا تھا۔

عتبہ تمام رات ہاشمی سے ملاقات کا منصوبہ بناتا رہا۔صبح ہوتے ہی اس نے ہاشم کے گھر کا رخ کیا۔

ہاشم گھر میں موجود تھا۔عتبہ کی آواز پر وہ باہر آیا اور بڑی گرمجوشی سے ملا۔اس نے ہنس کے پوچھا:

''عتبہ خیریت تو ہے۔یہ صبح ہی صبح میں کیسے یاد آ گیا؟''

عتبہ نے افسردگی سے جواب دیا:

''ہاشم۔ میں بڑی پریشانی میں ہوں۔تم ہی میری مدد کر سکتے ہو۔''

''کیوں نہیں۔آخر دوست ہوتے کا ہے کے لئے ہیں۔ بتاؤ۔ میں تمہاری کیامدد کرسکتا ہوں؟''

عتبہ نے کہا:

''یہاں نہیں کہیں چل کے بیٹھیں گے پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی''۔

''عتبہ پریشان نہ ہو''ہاشم نے سوچتے ہوئے کہا۔''میں تمہارا پورا پورا ساتھ دوں گا۔تم جہاں کہو گے میں چلوں گا۔ ہاں پہلے یہ بتا۔کوئی مالی پریشانی تو نہیں۔جتنی رقم چاہو میں ساتھ لے چلوں۔''

''شکریہ ہاشم''عتبہ نے جواب میں کہا۔''فی الحال تو تمہیں اپنے دل کا حال سنانا ہے۔''

ہاشم چوکنا ہو گیا۔ اس نے پہلے حسرت سے عتبہ کو دیکھا پھر مسکرا کے پوچھا،''پیارے دوست کہیں دل تو نہیں لگا بیٹھے؟''

عتبہ نے مسکرا کر سر جھکالیااور بولا:

''ہاں.........یار.........کچھ ایسا ہی معاملہ ہے''۔

ہاشم نے بڑھ کے عتبہ کو گلے لگالیااور بولا۔

''فکر نہ کرو عتبہ۔بس یوں سمجھو تمہاری کامیابی یقینی ہے۔ میں تمہارے لئے جان لڑا دوں گا۔ کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ۔ میں بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں بیٹھ کے اطمینان سے باتیں کریں گے۔''

ہاشم والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کھاتا پیتا گھرانہ۔ اس کا تعلق بھی گروہ انصار سے تھا' ابھی اس کی شادی نہ ہوئی تھی۔ ہپاں نسبت ضرور لگی اور بات چل رہی تھی۔

ہاشم نے بیٹھک کھول دی اور دونوں دوست اندر آ بیٹھے۔

''ہاں۔ اب بتاؤ۔'' ہاشم نے شوخی سے پوچھا۔ ''کیا پریشانی ہے۔ لڑکی کس گھرانے کی ہے؟''

''انصاری''۔ عتبہ نے جواب دیا۔

''پھر پالا مارلیا''۔ ہاشم چہکا۔ ''پہلے میں کوشش کروں گا۔ ضرورت پڑی تو ابا جان سے مدد لوں گا۔ گروہ انصار کا کوئی فرد ابا جان کی بات نہیں ٹال سکتا۔ اس کے والد کا کیا نام ہے؟''

''قطریق سلمیٰ''

''کس محلے میں رہتے ہیں؟''

''یہ پتہ نہیں۔''

ہاشم کو بڑی حرانی ہوئی۔ ''یار کیا بات کر رہے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ وہ اس ملک کی ہے۔ ایران تو ران کی تو نہیں؟''

''یہ بھی پتہ نہیں۔'' عتبہ نے معصومیت سے کہا۔ ''مجھے تو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ اس کا نام ریابنت قطریق سلمیٰ ہیخاندان گروہ انصار اور سکونت سادہ۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ جانتا۔

''لڑکی سے مل چکے ہو؟''

''نہیں۔''

ہاشم جھلا اٹھا۔ ''عتبہ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے۔لڑکی کو دیکھا نہیں اور اس پر عاشق ہو گئے۔یہ نام پتہ کس نے بتایا تمہیں؟''

''اس کی ایک سہیلی نے''عتبہ کے ہاشم کو الجھتے ہوئے دیکھا تو خود ہی وضاحت کی۔''ہاشم میں تمہیں ایک پوری بات بتاتا ہوں۔ریا عید کے دن اپنی سہیلیوں کے ساتھ مسجد احزاب کی زیارت کو آئی تھی۔وہاں میں نے اسے صرف ایک نظر دیکھا تھا۔اس کا نام و پتہ دوسرے دن اس کی سہیلی نے بتایا۔اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ ریا اپنے گھر واپس چلی گئی ہے۔''

ہاشم سوچ میں پڑ گیا۔

عتبہ نے کہا۔

''ہاش۔خدا کے لئے کوئی مداوا کرو۔اس کا پتہ ٹھکانہ ڈھونڈو''

''کیا نام بتایا تھا تم نے اس جگہ کا؟''

''سادہ''

''سادہ......''ہاشم نے زیرلب دہرایا۔پھر پوچھا۔

''کیا اس کی سہیلی بھی اس کے ساتھ چلی گئی؟''

''نہیں۔وہ مدینہ میں رہتی ہے۔''

''اوہ۔تو پھر کیا مشکل ہے۔''ہاشم خوشی سے بے چین ہو گیا۔''کہاں رہتی ہے کیا نام ہے اس کا۔میں خود اس سے مل کے تمام باتیں معلوم کر لوں گا۔''

''یہی تو مشکل ہے ہاشم۔اس کی سہیلی دوسری عورتوں کے ساتھ تھی۔میں

جلدی میں اس کا نام پتہ نہ پوچھ سکا"

"عجیب گھامڑ ہو یار" ہاشم غصہ آ گیا۔ "نہ یہ پوچھا کہ سادہ کہاں ہے۔ نہ سہلی کا نام پتہ معلوم کیا۔"

عتبہ مایوس ہو گیا۔ اس کا آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

ہاشم کو ہنسی آ گئی۔ اس نے تسلی دی۔ "پیارے دوست دل نہ چھوٹا کرو۔ صبر سے کام لو۔ اللہ مشکل آسان کرے گا۔ یہ راہ عشق ہے عتبہ۔ اس میں بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔

اس کے بعد ہاشم اور عتبہ گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے از سر نو تمام باتوں پر غور کیا کئی منصوبے بنے اور رد ہوئے۔ دوپہر کا وقت ہو گیا۔ ہاشم کھانا لے آیا۔ دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔

عتبہ واپس جانے لگا تو ہاشم نے کہا:

"فرض کرو ہم نے ریا کا پتہ ڈھونڈ نکالا۔ ہم سادہ بھی پہنچ گئے لیکن ریا نے انکار کر دیا تو کیا ہوگا؟ اس پہلو پر تو ہم نے غور ہی نہیں کیا۔"

"ایسا نہیں ہوگا ہاشم۔ ریا نے مجھے خود ملاقات کا پیغام بھیجا تھا"۔

"پھر تم اس سے ملے کیوں نہیں؟"

دراصل پہلے دن میں گھبرا گیا تھا۔ کچھ جواب نہ دے سکا۔ پھر دوسرے ہی دن وہ چلی گئی۔

ہاشم کو اس کے بھولپن پر ہنسی آ گئی۔ "اچھا تم اطمینان سے جاؤ۔ میں اس وقت سے کوشش شروع کرتا ہوں۔ جیسے ہی کچھ پتہ چلا تمہارے پاس پہنچ جاؤں

گا۔"

اگلے دو دن اور تین راتیں عتبہ نے بہت بے چینی سے گزاریں۔ ایک تو ریا کا تصور۔ دوسرے ہاشم کا انتظار یہ دہری پریشانی اس کے لئے سوہان روح بن گئی۔ دن تو وہ ادھر ادھر گھوم پھر کر گزار دیتا لیکن راتیں۔ کاٹے نہ کٹتی تھیں۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ رات کی تنہائی میں اب شعرائے عرب کے عشقیہ اور خصوصاً فراقیہ اشعار گنگنانے لگتا۔ اسے شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر جب دل کو چوٹ لگی تو وہ اشعار جنہیں سن کر وہ کبھی برا سا منہ بنالیا کرتا تھا' اب اسے بہت اچھے معلوم ہوتے تھے۔

ایک رات اس نے دماغ پر زور دیا تو طبیعت موزوں ہو گئی اور زبان سے خود بخود شعر نکلنے لگے۔ صبح کوئی اشعار حافظہ سے محو ہو گئے لیکن دو اشعار یاد رہ گئے۔

نمبر 1 آہ میری ماہ پارہ! چودھویں رات کا چاند ہے اور سادہ
اس کا آسمان ہے ہائے میں اس روشن ستارے کو آسمان
سے کیسے توڑ لاؤں۔

نمبر 2 دوستو! ریا اپنے مسکن سادہ چلی گئی۔ اس کا قافلہ آسمان
سادہ کی طرف جا رہا ہے۔ میں روتے روتے بے دم ہو
گیا۔ آنکھوں میں آنسو باقی نہ رہے۔ کوئی مہربان ہے
جو تھوڑے آنسو مجھے قرض دے دے۔

"کچھ خبر ملی؟"

ہاشم اس کی حالت پر ہنس رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''عتبہ۔ تم نے تو بڑے بڑے عاشقوں کو مات دیدی ہے۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھو۔ برسوں کے بیمار نظر آتے ہو۔''

عتبہ خفگی سے بولا۔

''ہاشم تم اچھے دوست ہو۔ میری جان پر بنی ہے اور تم ہو کہ نصیحتوں کے دفتر کھول رہے ہو''۔

ہاشم دل میں شرمندہ ہوگیا۔ واقعی یہ وقت نصیحت کا نہ تھا اس نے بتایا۔

''عتبہ تم بالکل فکر نہ کرو۔ میں نے سب کچھ معلوم کرلیا ہے۔ ریا 'سادہ کے ایک رئیس گھرانے کی دوشیزہ ہے''۔

''مگر سادہ ہے کہاں؟

عتبہ نے بے چین ہوکر ہاشم کی بات کاٹ دی۔

''سادہ۔ عراق کی سرحد پر ایک بڑا قصبہ ہے۔ لیکن وہاں پہنچنا کچھ مشکل نہیں۔ میں نے سادہ جانے کے پورے انتظامات کر لئے ہیں۔ تم کہو تو کل ہی روانگی ہوسکتی ہے؟''

عتبہ کو اب اطمینان ہوا۔ وہ شکر گزر نظروں سے ہاشم کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہاشم۔ معاف کرنا۔ میں نے پتہ نہیں تمہیں کیا کچھ کہہ دیا۔ میں کس قدر خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسا دوست ملا ہے لیکن کیا میں وہاں اکیلا جاؤں؟'' ہاشم نے جواب دیا۔

''میں نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اسے پورا کروں گا۔ میں

تمہارے ساتھ عراق چلوں گا۔ وہاں پہنچ کر کوشش کریں گے۔ آگے اللہ کی مرضی۔ بس تم تیار رہو۔ پرسوں جمعہ ہے۔ نماز جمعہ کے بعد ایک قافلہ عراق کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ ہم اس کے ساتھ ہو لیں گے۔ اور عتبہ خوشی کے مارے دوبارہ ہاشم کے گلے سے لپٹ گیا۔



اس زمانہ میں مدینہ سے عراق کالے کوسوں دور معلوم ہوتا تھا۔ صحرائے عرب کو عبور کرنا موت کو دعوت دینا تھا۔ لیکن تجارتی قافلے تو ضرور رواں دواں رہتے تھے۔ عتبہ اور ہاشم بھی اللہ کا نام لے کر ایک قافلے کے ساتھ ہو لئے۔ ہاشم کو روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے اور منزل بہ منزل چلتے ہوئے آخر یہ دونوں عراق کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ وہاں وہ قافلے سے جدا ہوئے اور انہوں نے سادہ کا رخ کیا۔

چلتے چلتے جب سادہ صرف ایک منزل رہ گیا تو عتبہ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ امید و بیم کے جھکڑ چلنے لگے۔ پھر یہ منزل بھی طے ہوئی اور دونوں دوست ایک سرائے میں جا اترے۔ ہاشم نے سادہ میں داخل ہوتے ہی ذطریق سلمی کا پتہ پوچھ لیا تھا۔ اس نے اس سرائے کا انتخاب کیا جو ذطریق کی حویلی سے قریب ترین تھی۔

عربہ بڑا مضطرب تھا۔ رات کھانا کھاتے ہوئے بولا:

”اب کیا کرنا ہوگا ہاشم۔ ریا سے ملنے کی کیا صورت ہوگی؟“

ہاشم نے ہاتھ روک کر جواب دیا:

''پیارے ذرا سفر کی تھکان تو دور ہو لینے دو۔ قسمت نے جب یہاں تک پہنچایا ہے تو ریا تک رسائی کی کوئی صورت بھی پیدا ہو جائے گی''۔

''نہیں ہاشم''۔ عتبہ بے چینی سے بولا۔ ''تم صبح کو ریا کی حویلی کی طرف جاؤ''۔

''عتبہ۔ بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ پردیس کا معامہ ہے''ہاشم نے اسے سمجھایا۔ ''پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا۔ ریا سے ملنا کوئی آسان بات نہیں۔ پھر ہمارا مقصد صرف ریا سے ملاقات کرنا تو نہیں۔ ہم تو فطریق کو کسی طرح رضامند کر کے تمہاری اور ریا کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

عتبہ بولا۔

''یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ریا کی رضامندی بھی تو ضروری ہے۔ بغیر اس سے ملے اس کی مرضی کا کیا پتہ لگے گا''۔

ہاشم نے نرمی سے کہا۔

''محبت نے تمہاری عقل پر پردہ ڈال دیا ہے۔ فرض کرو تمہاری ملاقات ریا سے ہوگئی۔ اس کی مرضی بھی معلوم ہوگئی لیکن اگر بات اس کے باپ کے کانوں تک پہنچی تو پھر کیا ہوگا۔ تم عربوں کا دستور بھول رہے ہو اگر والدین کو ذرا بھی شبہ ہو جائے کہ لڑکی کسی سے محبت کرتی ہے تو پھر پچا ہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے اس کے والدین کسی صورت راضی نہ ہوں گے خواہ انہیں لڑکی کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے''۔

عتبہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بولا۔

''ہاشم! شادی کا پیغام دینے سے پہلے ریا کی مرضی معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ کیا پتہ وہ مجھے بھول گئی ہو۔''

''یار! تم تو محبت کے بڑے دعوے کرتے تھے،۔اس نے مجھے یوں دیکھا۔ سہیلی کو بھیجا۔ ملاقات کی خواہش کی۔ کیا یہ سب باتیں جھوٹی تھیں۔ تمہیں اپنی محبت پر اعتماد نہیں۔ یاد رکھو اگر عشق صادق ہو تو دوسری طرف اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ عورت ذات محبت کرتی ہے تو پھر بھولتی نہیں...... محبت تو عورت کی زندگی ہوتی ہے''۔

''مگر اب تم کرو گے کیا؟''عتبہ نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''وہی جو تم چاہتے ہو۔''ہاشم نے جواب دیا۔''میں کوشش کروں گا کہ تمہاری اور ریا کی ملاقات ہو جائے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہوا تو پھر اس کی مرضی معلوم کرنے کی کوئی اور صورت نکالوں گا۔''

عتبہ خاموش ہو گیا تھا مگر اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔

ہاشم کو عتبہ کی بے چینی کا پورا پورا احساس تھا۔ پس صبح ہوتے ہی اس نے عتبہ کو تو سرائے میں چھوڑا اور وہ خود طریق سلمی کی حویلی کی طرف روانہ ہوا۔

سادہ ایک اوسط درجے کی تجارتی منڈی تھی۔ قصبے میں کئی بازار تھے اور لوگ دور دور سے خرید و فروخت کے لئے آتے تھے۔ ہر طرف بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ ریا کی حویلی سے کچھ فاصلہ پر ایک بازار تھا۔ ہاشم نے بازار کا ایک چکر لگایا۔ پھر ایک ایسی جگہ آ کر کھڑا ہو گیا جہاں سے حویلی کا دروازہ صاف نظر آتا تھا۔ وہ دیر تک حویلی کی طرف آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا۔ وہ کھڑے کھڑے تنگ آ گیا تو اس

نے ایک بار پھر پیر سیدھے کرنے کے لئے بازار کا ایک اور چکر لگایا لیکن نظریں ریا کی حویلی کی طرف ہی رکھیں۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد حویلی سے ایک عورت نکلی اس کے ہاتھ میں سامان کی ٹوکری تھی۔ وہ عورت کچھ اس طرح مٹک مٹک کے چل رہی تھی کہ ہاشم اسے دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ عورت سیدھی بازار کی طرف آ رہی تھی۔ اس کی صورت شکل تو بس واجبی سی تھی لیکن ٹھسہ بڑا تھا ہاشم سمجھ گیا کہ یہ حویلی کی نوکرانی ہے۔ پس اسد کے ذہن میں امید کی ایک کرن پھوٹی۔ ایسی عورتیں خودنمائی کی بہت شائق ہوتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ انہیں دیکھا جائے اور تعریف کی جائے۔

عورت بازار میں داخل ہوئی تو ہر طرف سے اس پر نظریں پڑنی شروع ہو گئیں۔ اس نے اور زیادہ اترا کر چلنا شروع کر دیا۔ ہاشم دو قدم آگے بڑھ کے کھڑا ہو گیا۔ لونڈی اس کے قریب سے گزری تو ہاشم نے اسے گھور کے دیکھا اور خواہ مخواہ مسکرا دیا۔ لونڈی ہاشم کو مسکراتے دیکھ کر ٹھٹک گئی لیکن فوراً ہی سنبھل کے آگے بڑھ گئی۔

ہاشم ذرا فاصلہ دے کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ ہاشم اپنے دوست عتبہ کی طرح بڑا طرحدار اور خوبصورت جوان تھا۔ چوڑا سینہ۔ کھلتا ہوا رنگ۔ ہنستی آنکھیں، شانوں تک بال، پس لونڈی کا اسے دیکھ کر ٹھٹکنا فطری امر تھا۔

لونڈی بڑی چالاک تھی۔ کچھ دور سیدھی چلتی رہی پھر اک دم پلٹ کر دیکھنے لگی۔ ہاشم کوشش کے باوجود خود کو اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ رکھ سکا۔ آخر دونوں کی نظریں ملیں۔ لونڈی نے ہاشم کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ میں تمہاری چوری

پکڑ لی..... مگر خود ہی فوراً موڑ کر آگے بڑھ گئی۔ ادھر ہاشم کا حوصلہ بڑھ گیا۔

تعاقب جاری رہا۔ لونڈی سامان خریدتی اور ٹوکری بھرتی رہی۔ کبھی کبھی وہ انکھیوں سے ہاشم کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ اب ہاشم نے خود کو چھپانا بے سود سمجھا پھر بھی اس نے درمیانی فاصلہ برقرار رکھا۔

لونڈی ٹوکری اٹھائے بازار سے باہر رک کر ہاشم کی طرف دیکھا اور دعوت ملاقات دے گئی۔ ہاشم ڈرتا، جھجکتا، لوگوں کی نظریں بچاتا لونڈی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ لونڈی حویلی سے مڑ کر کسی اور طرف چل پڑی۔ اس رستے پر آمد و رفت کم تھی۔ آگے ایک باغ نظر آ رہا تھا۔ لونڈی باغ میں داخل ہوگئی۔ ہاشم نے بھی قدم بڑھا دیئے۔

باغ پر فضا تھا۔ بچوں کے لئے جھولے پڑے تھے۔ بیٹھنے کے لئے سنگیں بنچیں بھی تھیں۔ مرد اور عورتیں ادھر ادھر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ لونڈی بھی ایک طرف پڑی خالی بنچ پر بیٹھ گئی۔ ہاشم کو دعوت مل چکی تھی۔ وہ بے جھجک اس کے پاس چلا گیا اور اس کے اشارے پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''میرا پیچھا کر رہے تھے؟'' لونڈی کے لہجے میں نرمی اور پیار تھا۔

''ہاں......'' ہاشم نے اعتراف کیا۔

''کیوں؟'' وہ مسکرائی۔ وہ حسین تو نہ تھی مگر جوانی کی چھب تھی۔

''کچھ باتیں کرنا ہیں تم سے۔''

''بہت سی باتیں کرو۔ بے خوف و خطر'' لونڈی نے شہ دی۔

''تو طریق سلمٰی کی حویلی میں رہتی ہو؟''

''ہاں.....مگر حویلی کی مالک نہیں لونڈی ہوں۔''اس نے پوری صاف گوئی سے کام لیا۔

''بڑی شاندار حویلی ہے۔''ہاشم نے یونہی کہہ دیا۔اصل موضوع کی طرف آنے کے لئے اسے کوئی موزوں جملہ ہی نہیں مل رہا تھا۔

''اور میں کیسی ہوں؟''لونڈی بڑی بیبا کی سے بولی۔

ہاشم سہم گیا۔''تم بھی اچھی ہو۔''

لونڈی ہنس کے بولی۔''یہ تو میں جانتی ہوں جبھی تو اتنی دیر سے میرا پیچھا کر رہے ہو۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''شیرونی.....''

ہاشم نے جی کڑا کر کے پوچھا:

''میرا ایک کام کرو گی شیرونی؟''

''ایک نہیں دس کام کہو تم بھی مجھے اچھے لگتے ہو''

ہاشم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔بات بڑھ چکی تھی۔اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا:

''ریا تمہاری کون ہے؟''

شیرونی جیسے چونک پڑی۔قہر آلود نظروں سے ہاشم کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''اچھا تو ریا سے ملنے کے لئے تم نے میرا سہارا ڈھونڈا ہے؟''

ہاشم جلدی سے بولا۔''نہیں نہیں شیرونی تم غلط سمجھ رہی ہو۔ مجھے ریا سے کوئی

تعلق نہیں۔ میں نے تو تمہاری ریا کی صورت تک نہیں دیکھی۔"

رقابت کی جو آگ شیرونی کے سینے میں بھڑک اٹھی تھی وہ ذرا ٹھنڈی ہوئی۔ تو نرم لہجے میں بولی۔"پھر تم نے ریا کو کیوں پوچھا؟ وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں بہت نیک اور پاکباز ہے۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ خدانخواستہ وہ ایسی ویسی ہے۔ میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا یہ وہی ریا ہے جو چند روز پہلے مدینہ کی زیارت کو گئی تھی"۔

شیرونی بولی:

"ہاں ریا بی بی کی خالہ مکہ شریف میں رہتی ہیں۔وہ پہلے مکہ گئیں پھر مدینہ شریف ہو کر واپس آ گئیں۔لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟"

ہاشم نے ادھر ادھر دیکھا۔لوگ اپنی اپنی باتوں اور کاموں میں لگے تھے ان کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔پس ہاشم نے راز داری سے کہا:۔

"شیرونی بات یہ ہے کہ میرا ایک دوست ہے عتبہ۔اس نے تمہاری ریا کو مسجد احزاب میں دیکھا اور دیکھتے ہی ہوش کھو بیٹھا۔اس کا جو حال ہے دیکھا نہیں جاتا۔ سے تن بدن کا ہوش نہیں۔ میں پتہ لگاتے لگاتے یہاں تک پہنچا ہوں۔اگر تم مدد کرو تو کوئی ایسی سبیل نکل سکتی ہے کہ وہ دونوں مل سکیں اور دونوں کو قرار آ جائے۔"

شیرونی تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر بولی:

"کیا ریا بی بی تمہارے دوست کو پسند کرتی ہیں؟"

"خیال تو یہی ہے۔"ہاشم نے جواب میں کہا۔"لیکن پہلے اس بات کی بھی

تصدیق کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ریا سے مسجد احزاب کا حوالہ دے کر پوچھو۔ اگر ریا بھی میرے دوست کی طرح بے چین ہے تو پھر اگلا قدم اٹھایا جائے۔"

شیرونی نے دیدے لکاتے ہوئے پوچھا:

"اگلے قدم سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

ہاشم نے جواب دیا:

"شیرونی۔ ہم لوگ خاندانی شریف ہیں۔ ہم کوئی غلط قدم نہیں اٹھائیں گے۔ اگر ریا کی مرضی ہوئی تو ہم اسے بیاہ کر باقاعدہ مدینہ لے جائیں گے۔"

شیرونی نے دریافت کیا:

"تمہارا دوست ہے کہاں؟"

"ہم دونوں قریب کی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں"۔

شیرونی خاموشی سے ہاشم کو دیکھتی رہی۔ ہاشم دل ہی دل میں لرز رہا تھا پھر شیرونی نے خالص تاجرانہ انداز میں پوچھا:

"میں نے تمہارے دوست کا کیام کرادیا تو مجھے کیا ملے گا؟"

ہاشم نے اس کام کا مول لگاتے ہوئے کہا:

"میں تمہیں ایک ہزار دینار دے سکتا ہوں۔"

شیرونی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور ہاشم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی۔

"میں معاوضہ طلب نہیں کر رہی۔ صرف یہ وعدہ کرو کہ کام ہو جانے کے بعد تم مجھے نہیں بھولو گے"

ہاشم ذرا سا ہچکچایا پھر ہنستے ہوئے بولا:

''واہ شیرونی تم بھی کوئی بھولنے کی چیز ہو۔تمہارے اس احسان سے تو میری گردن عمر بھر نہ اٹھ سکے گی''

''اچھا تو پھر پکا وعدہ کرتے ہو؟''شیرونی اپنی پوری پوری مضبوطی کرنا چاہتی تھی۔

''ہاں۔ہاں۔پکا وعدہ کرتا ہوں۔''ہاشم نے دل پر جبر کرکے کہا۔اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔

شیرونی کو اطمینان ہو گیا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ٹھیک ہے۔کل تم اس وقت میرا یہاں انتظار کرنا۔میں بی بی ریا سے پوری بات کرکے آؤں گی''

ہاشم خوش خوش سرائے پہنچا۔عتبہ بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا تھا اور اس کا پورا جسم پسینے میں تر تھا۔اس نے ہاشم کو دیکھتے ہی پوچھا:

''کیا ہوا ہاشم۔کچھ کام بنا؟''

ہاشم نے ہنستے ہوئے کہا:

''پہلے منہ میٹھا کراؤ پھر بتاؤں گا۔''

عتبہ مارے خوشی کے ہاشم سے لپٹ گیا۔

''دیکھ بھائی۔میں نے تیری ریا تک رسائی نکال لی ہے اب تیری کامیابی اس کی مرضی پر ہے۔اس نے ہاں کر دی تو بس کام بن گیا ورنہ......''

عتبہ منت سے بولا:

''پیارے دوست۔میرا دل زیادہ نہ دکھاؤ۔صاف صاف بتاؤ۔تم کیا کر

آئے ہو؟''

''میں نے ریا کی لونڈی کے ذریعہ اس کے پاس پیغام بھیجا ہے اگر ریا نے تمہیں پہچان لیا اور وہ بھی تمہاری طرح بے کل ہے تو ہم شریفوں کی طرح بذریعہ سلمٰی کے پاس تمہارا رشتہ لے کر جائیں گے اور پھر وہی ہو گا جو منظور خدا ہو گا''۔

''لیکن وہ مجھے پہچانے گی کیسے اس نے مجھے دیکھا ہی کب ہے۔'' عتبہ نے اپنا خدشہ بیان کیا۔

ہاشم عتبہ کی بے تکی باتوں پر غصہ آ گیا۔ بولا

''دیکھو عتبہ۔ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اگر اسے تم سے ذرا سی بھی محبت ہے تو وہ فوراً پہچان لے گی۔ نظر مل جائے تو تصویر دل میں اتر جاتی ہے''۔

عتبہ پھر بھی مطمئن نہ ہوا۔ اگر ریا نے انکار کر دیا تو کیا ہو گا؟

''تو میں سمجھوں گا کہ تمہاری محبت میں خلوص نہیں''۔ ہاشم نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ایسی صورت میں پھر ہم جدھر سے آئے ہیں اسی طرف چپ چاپ لوٹ جائیں گے۔ یہ مدینہ نہیں، سادہ ہے۔ عتبہ ہم نے کوئی غلط بات کی تو بدنامی کے علاوہ ایسی مرمت ہو گی کہ مدینہ واپس جانا مشکل ہو جائے گا۔

عربہ مایوس ہونے لگا تو ہاشم نے نرم لہجے میں کہا:

''اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھو عتبہ۔ ابھی سے دل کیوں چھوٹا کرتے ہو۔ کل تک انتظار کرو۔ اللہ بہتر ہی کرے گا''۔

دوسرے دن شیرونی حسب وعدہ ٹھیک وقت پر پہنچ گئی۔ آج اس کی سج دھج

ہی نرالی تھی۔ وہ ہنستی کھیلتی اٹھلاتی ناز نخرے دکھاتی باغ میں داخل ہوئی۔

عتبہ نے وقت سے پہلے ہی ہاشم کو باغ بھیج دیا تھا۔ ہاشم چلاتا ہی رہا کہ ابھی بہت وقت پڑا ہے لیکن عتبہ نے ایک نہ سنی اور جب تک ہاشم سرائے سے نکل نہ گیا۔ اسے چین نہ آیا۔ پس ہاشم صبح ہی سے باغ میں آکر بیٹھ گیا تھا لیکن وہ گھبرایا ہوا تھا اور سہم رہا تھا۔ اسے شیرونی کے اطوار اچھے نظر نہ آتے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں دوست کی مدد کرتے کرتے وہ خود کسی جنجال میں نہ پھنس جائے۔

شیرونی ہاشم کے پاس پہنچ کے آہستہ سے کھنکاری۔ ہاشم نے چونک کر دیکھا ۔شیرونی دلہن بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ہاشم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

شیرونی بنیچ پر بیٹھ گئی۔ ہاش سوال کرنے ہی والا تھا شیرونی بول پڑی:۔

''کیسی لگتی ہوں؟''

ہاشم کا خون خشک ہو گیا۔ مردہ سی آواز میں بولا:

''اچھی لگتی ہو۔''

''میں جانتی تھی کہ تم یہی کہو گے'' وہ غمزے سے بولی:''میں لونڈی ضرور ہوں مگر شریف زادیوں کی طرح رہتی ہوں۔ کیا مجال کے کوئی ایسا ویسا آدمی نظر اٹھا کر بھی میری طرف دیکھے۔ میں آنکھیں پھوڑ دوں اس کی''

''ٹھیک ہے۔''ہاشم نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا:''ہاں وہ ریا نے کیا جواب دیا؟''

''اس کی بات تو بس پکی سمجھو''۔شیرونی نے مسکراتے ہوئے بتایا:''مین کہتی ہوں دونوں کا جوڑ خوب رہے گا۔ میری بی بی ریا ماہتاب ہیں ماہتاب''

''میرا دوست عتبہ بھی آفتاب ہے''ہاشم نے کہا۔ ''لیکن یہ تو بتاؤ ریا نے کیا کہا۔اس نے میرے دوست کو پہچانا کہ نہیں؟''

''یہ بات تم مجھ پر چھوڑ دو۔''شیرونی کچھ سوچتے ہوئے بولی:''بی بی ریا نے پہچان تو لیا ہے لیکن وہ تمہارے دوست کو دیکھنا چاہتی ہیں''۔

ہاشم نے جلدی سے پوچھا:

''کب' کہاں اور کیسے دیکھیں گی؟''

آج اور ابھی۔شیرونی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔''تم اپنے دوست کو لے آؤ۔ حویلی کے سامنے سے آہستہ آہستہ گزرو۔بس وہ دیکھ لیں گے.....لیکن خبردار۔تم لوگ حویلی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا۔''

''میں ابھی اسے بلا کر لاتا ہوں''۔اور ہاشم اٹھ کھڑا ہوا۔

شیرونی جھٹ بولی:

''لیکن ایک بار پھر تمہیں یہاں آنا ہے۔تم دونوں حویلی کے سامنے سے گزر کر اسی باغ میں آجانا''۔

ہاشم نے چلتے چلتے رک کر پوچھا۔

''یہاں واپس آکر کیا کریں گے ہم؟''

''پردیسی بیوقوف بھی ہوتے ہیں شیرونی نے طنزاً کہا۔''

ہاشم اس طنز پر تلملا کر رہ گیا لیکن سوائے شیرونی کا منہ دیکھنے کے اور کچھ نہ کہہ سکا۔

''میں جھوٹ تھوڑی کہہ رہی ہوں۔دیکھو اگر تم یہاں واپس نہ آؤ گے تو

تمہیں کیسے معلوم ہوگا کہ بی بی ریا نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ تم یہاں آ کر میرا انتظار کرنا۔ میں کسی بہانے تمہارے پاس آ کر سب باتیں تمہیں بتا دوں گی۔"

تلخی کم ہو گئی اور ہاشم کے چہرے پر غم و غصہ کی ابھرنے والی لکیریں مٹنے لگیں۔ وہ شیرونی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سرائے کی طرف روانہ ہو گیا۔

ذطریق سلمی کی قلعہ نما پکی پکی حویلی بڑی سڑک کے کنارے واقع تھی۔ اس سڑک پر بڑی آمد و رفت رہتی تھی۔ ہاشم نے سرائے سے چلتے وقت عتبہ کو تاکید کر دی کہ وہ حویلی کی طرف بھول کے بھی نہ دیکھے، وہ سڑک پر آئے اور آہستہ آہستہ حویلی کی طرف چلنے لگے۔

عتبہ کا دل سینے میں بلیوں اچھل رہا تھا۔ ہاشم نے اسے جو باتیں بتائیں تھیں اس سے اسے یہ امید بندھ گئی تھی ریا اسے بھولی نہیں ہے۔ لیکن اب اسے ایک اہم فیصلہ عتبہ کے لئے زندگی اور موت کا فیصلہ تھا۔ اسے پہچاننے کے باوجود اگر اس نے انکار کر دیا تو پھر کیا ہوگا۔ یہ خیال اسے بار بار پریشان کر رہا تھا۔

عتبہ اور ہاشم سر جھکائے ریا کی حویلی کے صدر دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ جب وہ عین دروازے کے سامنے پہنچا تو حویلی کی بڑی ڈیوڑھی سے ایک قہقہہ بلند ہوا بالکل ایسا قہقہہ جیسا اس نے مبدا اضراب میں سنا تھا۔ عتبہ نے دل پر بڑا جبر کیا لیکن اس کی نظریں غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف اٹھ گئیں پھر عتبہ کی آنکھوں میں بجلیاں سی لہرا گئیں۔ ریا کا پھول جیسا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ اس کے قدم اک دم اگ گئے۔ ہاشم گھبرا گیا اس نے فوراً عتبہ کے پہلو میں ٹہوکا مارا۔ عتبہ سنبھل گیا اور منہ سیدھا کر کے چلنے لگا۔

باغ کی طرف واپس جانے کے لئے عتبہ کو پھر حویلی کے سامنے سے گزرنا پڑا۔اس نے کنکھیوں سے دیکھا:۔

ریا اب تک اپنی لونڈی کے ساتھ ڈیوڑھی میں کھڑی مسکرارہی تھی۔عتبہ کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔نا امید کے بادل چھٹ گئے اور کامیابی کی روشنی نظر آنے لگی۔

عتبہ اور ہاشم باغ میں پہنچ کے شیرونی کا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد شیرونی اٹھلاتی ہوئی آگئی۔وہ دوسرا جوڑا پہن کر آئی تھی۔ ہاشم دل ہی دل میں سلگ کر رہ گیا۔

شیرونی بی بے تکلفی سے عتبہ اور ہاشم کے درمیان بیٹھ گئی۔عتبہ گھبرا کر ذرا ہٹ گیا۔ہاشم نے بھی ذرا فاصلہ کرلیا۔انہیں شیرونی کی بے شرمی پر خود شرم آرہی تھی لیکن ان کی نظریں شیرونی پر جمی تھیں۔وہ عتبہ کی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے بے چین تھے۔

شیرونی ہاشم کی طرف جھکتے ہوئے بولی:

"اپنے دوست کو مبارکباد دو۔بی بی ریا نے انہیں پہچان لیا ہے۔اب تم یہ پیغام دے سکتے ہو۔"

عتبہ کے کان ادھر ہی لگے تھے۔اس نے یہ مژدہ جانفزا سنا تو خوشی سے پاگل ہوگیا۔خوشی تو ہاشم کو بھی ہوئی لیکن اسے شیرونی کے قرب سے گھن آرہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ بھاگ کے باغ سے نکل جائے۔

عتبہ خوشی سے بے قابو ہوکر بولا:

''ہاشم۔تم ابھی فطریق سلمٰی سے ملنے جاؤ۔''

ہاشم،شیرونی کی حرکتوں سے دل برداشتہ ہو رہا تھا۔وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بیباک لونڈی کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی کر دے۔اسے شیرونی کی صورت سے نفرت ہو رہی تھی۔

عتبہ کو جواب نہ ملا تو اس نے پھر کہا:

''آج فطریق سلمٰی سے ملنے میں کوئی ہرج تو نہیں؟''

ہاشم چونک کے شیرونی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''اس معاملے میں شیرونی کا مشورہ زیادہ مفید ہوگا''۔

عتبہ نے شیرونی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آج نہیں۔تم دونوں کل میرے آقا سے ملو گے''

شیرونی کے لہجے میں حکم جیسی سختی تھی۔عتبہ اور ہاشم سہم کر رہ گئے:

''آج ملنے میں کیا حرج ہے؟''ہاشم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

شیرونی نے اس تلخ لہجے میں کہا:

''ابھی کچھ باتیں اور بھی ہیں،وہ میں شام کو بتاؤں گی''

ہاشم کو جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی۔اس کے ہاتھ پیر سنسنانے لگے شیرونی نے تحکمانہ لہجے میں کہا:

''تم دن چھپے اس جگہ مجھ سے ملو گے پھر میں بتاؤں گی کہ آقائے فطریق سے کیا کہنا ہے''

شیرونی،ہاشم کو دیکھتے ہوئے کھڑی ہوگئی اور جواب کا انتظار کئے بغیر تیز تیز

قدم اٹھائے باغ سے نکل گئی۔ عتبہ اور ہاشم نے ایک دوسرے کو اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟ شیرونی غروب آفتاب کے بعد کیا کہنا چاہتی ہے؟

شیرونی کے سخت لہجے سے دونوں دوست سخت پریشان تھے۔ عتبہ کا دماغ ریا کی محبت کی وجہ سے ماؤف سا ہو رہا تھا۔ لیکن وہ ایسا نادان نہ تھا کہ شیرونی کی باتوں اور اس کے اشاروں کو نہ سمجھتا۔

آخر عتبہ نے سکوت توڑا:

''کیا سوچ رہے ہو ہاشم؟''

ہاشم نے پہلے مسکرانے کی کوشش کی پھر کہا:

''جانتے ہو۔ شیرونی مجھے کیوں بلا رہی ہے؟''

''شیرونی ڈائن ہے ہاشم۔ اس کے جال میں نہ پھنسنا۔'' اور عتبہ کو جیسے غصہ آ گیا۔

''مگر پھر تمہارا کیا بنے گا میرے دوست؟''

''ہاشم مجھے تمہاری دوستی پر ناز ہے'' عتبہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''مجھے ریا سے بھی محبت ہے لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے تمہاری شرافت کو قربان نہیں کروں گا خواہ ریا مجھے ملے یا نہ ملے۔ تم رات کو اس سے ہرگز نہیں ملو گے۔''

ہاشم کو عتبہ کی بات سے بڑا سہارا ملا۔ اس نے کہا۔

''عتبہ۔ تم نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ لیکن اب ہمیں اپنا راستہ خود تلاش کرنا ہوگا۔ شیرونی کا سہارا کمزور ہے اور خطرناک بھی''۔

عتبہ نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ ''ہاشم میری طرف سے مطمئن رہو۔تم جو کہو گے میں اس پر عمل کروں گا۔تم کہو تو میں ابھی مدینہ چلنے کو تیار ہوں؟''

ہاشم نے مسکرا کر جواب دیا:

''نہیں عتبہ۔ہم اتنی پریشانیاں اٹھا کر یہاں پہنچے ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ ریا تم کو پسند کرتی ہے ایسی صورت میں کوشش کے بغیر واپس جانا عقلمندی نہیں''۔

''پھر تم نے کیا سوچا ہے؟'' عتبہ نے بے چینی کا اظہار کیا۔

ہاشم نے پر جوش انداز میں جواب دیا:

''عتبہ ہم فطریق سلمی سے ملیں گے''۔

''لیکن شیرونی......'' عتبہ کہتے کہتے رک گیا۔

ہاشم نے اسے اطمینان دلایا:

''شیرونی کی فکر نہ کرو اس کی حیثیت صرف ایک لونڈی کی ہے۔ریا رضامند ہے۔اگر فطریق نے ''ہاں'' کر لی تو شیرونی ہمارا کیا بگاڑ سکے گی۔ہمیں اتنی جلد ہار نہیں ماننا چاہئے۔

عتبہ خیالات میں گم ہو گیا لیکن ہاشم نے اس کی خاموشی کو جلد ہی توڑ دیا۔

وہ بولا:

''عتبہ! ہم فطریق سے آج ہی ملیں گے''۔

عتبہ کو بڑی حیرانی ہوئی۔اس نے پوچھا:

''آج.....ہمیں کچھ دن اور غور کرنا چاہئے''

''نہیں عتبہ۔ شیرونی کو مہلت دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ وہ شام تک ہمارے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔ اس وقت سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہئے۔''

عتبہ اس نکتہ کو نہ سمجھ سکا۔ اس نے پوچھا:

''میں نہیں سمجھ سکا ہاشم۔ اتنی جلدی ملنا کیوں ضروری ہے؟''

ہاشم نے اپنے منصوبے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

''غروب آفتاب پر شیرونی مجھ سے ملنے یہاں آئے گی۔ ظاہر ہے کہ وہ کچھ دیر میرا انتظار کرے گی۔ یہی وقفہ ہمارے لئے بہترین ہوگا۔ ہم اس کی عدم موجودگی میں فطریق سلمیٰ سے ملیں گے۔ فطریق ایک بار رضامند ہو گیا تو پھر شیرونی کچھ نہ بگاڑ سکے گی''۔

عتبہ اپنے دوست کے اس منصوبہ پر جھوم اٹھا۔

..........☆..........

سادہ کی آبادی میں شمعیں اور چراغ جل اٹھے۔ مشعیں جھلملانے لگیں۔ شیرونی نے حویلی سے قدم نکالے آج اس کا یہ تیسرا جوڑا تھا۔ حویلی کے دروازے پر جلتی ہوئی شمعوں میں اس کے نئے کپڑے جھلملانے لگے۔

عتبہ اور ہاشم حویلی کے قریب چھپے کھڑے تھے۔ انہیں شیرونی کے جانے کا انتظار تھا۔ شیرونی حویلی سے نکل کر اندھیرے میں گم ہوگئی تو عتبہ اور ہاشم حویلی کے دروازے پر پہنچے۔ دروازے کے چوکیدار نے دو شریف زادوں کو دیکھا تو ادب سے سلام کیا۔

ہاشم نے کہا:

''برادر۔ اپنے آقا سے جا کر کہو کہ مدینہ سے ''اجنبی ان سے ملنے آئے ہیں۔''

مدینہ کے نام میں جانے کیا تاثیر تھی کہ چند ہی لمحوں بعد فطریق سلمی بھاگتا ہوا دروازے پر آیا۔

''السلام علیکم''

''وعلیکم السلام''

عتبہ اور ہاشم نے جواب دیا پھر بڑھ کر فطریق سے بغل گیر ہوئے۔

فطریق نے بڑے ادب سے پوچھا۔

''آپ لوگ دارالہجرت مدینہ سے تشریف لائے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' ہاشم نے اسی ادب سے جواب دیا۔

فطریق نے انہیں سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''سامان کہاں ہے آپ کا؟''

''ہم لوگ قریب ہی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔'' ہاشم نے جواب دیا۔

فطریق بڑے خلوص سے بولا:

''واہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ تو اس سر زمین سے آئے ہیں جہاں کی خاک ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے۔ ایسے معزز مہمان سرائے میں کیسے ٹھہر سکتے ہیں۔ مہمان نوازی کا شرف مجھے ہی بخشئے؟'' ہاشم نے جلدی سے کہا:

''آپ کو زحمت نہیں دینا چاہتے۔ ہم لوگ وہاں بڑے آرام سے ہیں۔ بس کچھ ہی دن قیام رہے گا۔'' ''کتنے دن قیام کا ارادہ ہے؟'' فطریق نے محبت سے پوچھا۔

''محترم بزرگ۔ ہم ایک ضروری کام سے آئے ہیں۔ جتنی جلدی کام ہو جائے گا ہم چلے جائیں گے۔''

فطریق نے عرب مہمان نوازی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''دیکھئے آپ لوگ سادہ میں ایک روز رہیں یا ایک مہینہ' آپ ہمارے مہمان رہیں گے۔ دارالہجرت سے آنے والوں کی مہمان نوازی کا شرف کوئی روز روز تو حاصل نہیں ہوتا۔ بس اب آپ اندر تشریف لے آیئے۔''

ہاشم اور عتبہ ایک دوسرے کا منہ دیکھ کے رہ گئے۔

فطریق نے آواز دے کر مہمان خانہ کھلوایا اور انہیں وہاں لے گیا۔ کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ فطریق انہیں بٹھا کر اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد خادم کے سر پر کھانے کا خوان رکھوائے واپس آ گیا۔ یہ سب باتیں کچھ اس قدر اچانک ہوئی تھیں کہ ان دونوں کو سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا اور انہوں نے خود کو حالات کے حوالے کر دیا۔

فطریق سلمٰی نے ان کے ساتھ کھانا کھایا پھر بولا:

''چلئے۔ سرائے سے سامان لے آئیں۔''

ہاشم اور عتبہ نے لکھ انکار کیا مگر فطریق نے ایک نہ مانی اور دو ملازموں کو لے کر یہ سرائے پہنچے۔ سامان ان کے پاس تھا ہی کیا۔ بستر اور پہننے کے کپڑے۔ دو

گھوڑے اور دو اونٹ اور نقد رقم جو ہاشم کی کمر سے بندھی تھیلی میں تھی۔

یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے ہو گیا۔ عتبہ اور ہاشم سرائے سے فطریق سلمی کے مہمان خانے میں اٹھ آئے۔ فطریق کچھ دیر ان کے پاس بیٹھا مدینہ منورہ کے حالات پوچھتا رہا پھر ان کے آرام کے خیال سے رخصت ہو کر اندر چلا گیا۔

انہیں تنہائی میسر ہوئی تو چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔

ریا کو خادم سے مہمانوں کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ بہت حیران ہوئی۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مہمان وہی ہیں جن کا اسے انتظار تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہ آسکا کہ یہ لوگ آج کیسے آ گئے۔ شیرونی نے انہیں بتایا تھا۔ کہ یہ لوگ کل صبح آئیں گے۔ اس وقت اسے شیرونی کی غیر حاضری بڑی شاق گزر رہی تھی۔ اسے غصہ بھی آیا۔ کم بخت کہہ کر گئی تھی۔ کہ خالہ سے مل کے ابھی آتی ہوں۔ دو گھنٹے سے اوپر ہو گئے ابھی تک واپس نہیں آئی۔

ریا تکیہ پر سر رکھ کر انتظار کرنے لگی۔

شیرونی کو بھی ہاشم کا انتظار تھا۔ اسے قوی امید تھی کہ ہاشم اس سے ملنے باغ میں ضرور آئے گا۔ وہ بڑے ارمانوں سے حویلی سے نکلی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ باغ سے ہاشم کو لے کر وہ دریا والی پرانی حویلی میں جائے گی۔ حویلی آقا فطریق کی تھی اور خالی پڑی تھی۔ شیرونی نے فطریق سے کہہ سن کے اپنی بیوہ خالہ کو وہاں رہنے کی اجازت دلا دی تھی۔

شیرونی بڑی بیتابی سے ہاشم کا انتظار کر رہی تھی،۔ دو گھنٹے گزر گئے مگر ہاشم نہیں آیا۔ شیرونی کو غصہ آنے لگا۔

''بے وفا......ظالم'' وہ بڑبڑائی۔

اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی اور پھر تین گھنٹے کے مزید انتظار کے بعد شیرونی پیر پٹختی واپس آ گئی۔

ذطریق کی حویلی دو حصوں میں تقسیم تھی۔ بڑی ڈیوڑھی کی بائیں جانب مردانہ حصہ تھا۔ پہلے مہمان خانہ پھر چار چھوٹے چھوٹے کمرے ملازموں کے لئے۔ آگے بڑا سا برآمدہ۔

زنانے حصے میں بارہ کمرے تھے لیکن استعمال میں صرف پانچ تھے۔ پہلے تین کمرے ریا کے۔ چوتھا کمرہ شیرونی کو دیا گیا تھا۔ آخری پانچویں کمرے میں خود ذطریق رہتے تھے۔

جب سے ریا کی والدہ کا انتقال ہوا تھا ذطریق اسی ایک کمرے میں سمٹ کے رہ گئے تھے۔ وہ دیکھنا بڑے ملنسار اور منکسر المزاج انسان تھے۔ مہمان نوازی اور مہمان کے وہ دلدادہ تھے۔ ان کا خاندان لمبا چوڑا تھا۔ ایک نہ ایک مہمان روز جما رہتا۔ دو چار روز مہمان نہ آتا تو وہ دوستوں کو مدعو کر لیتے تھے۔

شیرونی ڈیوڑھی میں داخل ہوئی۔ مہمان خانے میں خوب روشنی پھیلی تھی۔ شیرونی ٹھٹکی۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ شیرونی نے جھانک کے دیکھا پھر فوراً سر پیچھے کھینچ لیا۔

عتبہ اور ہاشم اندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شیرونی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے ارادہ کیا کہ اندر جا کر ہاشم کی خبر لے پھر کچھ سوچ کے رک گئی اور بل کھاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

''ریا بستر پر پڑی شیرونی کی جلد واپسی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ باہر کھٹکا ہوا۔ ریا نے تکیہ سے سر اٹھا کر دیکھا۔ شیرونی تیز تیز قدموں سے برآمدے میں آرہی تھی۔ ریا جلدی سے اٹھ کے برآمدے میں آگئی۔ اس نے بڑھ کر شیرونی کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے آئی۔

''کہاں مر رہی تھی اتنی دیر سے؟'' ریا نے محبت اور غصے کے ملے جلے لہجے میں پوچھا۔

''بی بی اچھا ہوتا کہ مر گئی ہوتی''۔ شیرونی مردہ دلی سے بولی۔

ریا گھبرا گئی۔ ''خدا خیر اکرے۔ تجھ پر کیا ستم ٹوٹا؟''

شیرونی نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال جڑ دیا:

''یہ لفنگے یہاں کب آئے؟''

ریا نے حیرت سے اسے دیکھا اور سخت لہجے میں بولی:

''کسے کہہ رہی ہے۔ ہوش میں تو ہے تو؟''

شیرونی جیسے لڑنے پر آمادہ تھی۔ تیز آواز میں بولی:

''بی بی ریا! میں ہوش میں ہوں۔ یہ مدینہ شریف زادے نہیں وہاں کے لچے لفنگے ہیں''۔

''شیرونی زبان سنبھال ورنہ منہ نوش لوں گی۔ تو کس کا غصہ کس پر اتار رہی ہے۔ کسی سے لڑ کر آئی ہے کیا؟''

ریا نے پھٹکارا تو شیرونی کو ہوش آیا۔ مردہ آواز میں بولی:

''میں کسی سے نہیں لڑی لیکن ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ یہ لوگ ملنے کے قابل نہیں

ہیں۔"

ریا نے ذرا نرم لہجے میں پوچھا۔

"آخر کوئی وجہ بھی تو ہو۔انہوں نے تجھے کچھ کہا ہے؟"

شیرونی پینترا بدل کے بولی۔

"کچھ کہا ہو یا نہ کہا ہو لیکن میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گی۔"

ریا کا دماغ پھر گھوما۔اس نے شیرونی کا گریبان پکڑ لیا:

"دیکھ شیرونی۔اگر تو نے میرے معاملے میں ٹانگ اڑائی تو میں تجھے کچا چبا جاؤں گی۔"

شیرونی کچھ ڈر گئی لیکن ہاشم کے لئے جو انتقامی جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوا تھا اسے نہ دبا سکی۔

بولی:"بی بی ریا۔تم ابھی نادان ہو۔آدمی اپنے دوست سے پہچانا جاتا ہے۔جب ایک ایسا ہے تو دوسرا بھی ایسا ہوگا۔"

ریا کے دل کو شیرونی کی بات لگی۔اس نے کہا:

"چل یونہی سہی لیکن یہ تو بتا کہ ہاشم نے کیا مکاری کی یا دھوکہ بازی۔کچھ پتہ تو چلے؟"

اس کا جواب شیرونی کے پاس نہ تھا وہ کیسے کہتی کہ اس نے ہاشم کو باغ میں بلایا تھا اور وہ وہاں نہیں گیا۔

ریا شیر ہوگئی:

"بتاتی کیوں نہیں۔کس سے ڈر رہی ہے۔جو الزام لگایا ہے اسے ثابت کر

ہے۔"

"میں نے جو کہہ دیا۔ اس سے زیادہ نہیں بتا سکتی۔" شیرونی کو کوئی جواب نہ بن پڑا تو وہ کمرے سے باہر جانے لگی۔

ریا نے اسے پکڑ لیا اور دھمکی دی:

"خبردار جو تو نے مخالفت کی۔ چوٹی پکڑوا کے نکلوا دوں گی۔"

اور شیرونی جواب دیئے بغیر باہر نکل گئی۔

شیرونی کے خوف سے عتبہ اور ہاشم کو رات بھر نیند نہ آئی۔ وہ تمام رات جاگتے اور باتیں کرتے رہے۔ آخر طے پایا کہ اب اس معاملہ کو مزید طول دینا مناسب نہیں۔ جو تقدیر میں ہوگا وہ تو ہو کر رہے گا۔ اس لئے صبح ہوتے ہی ذطریق سلمیٰ سے صاف صاف بات کر لی جائے۔

صبح کا ناشتہ ذطریق نے ہاشم اور عتبہ کے ساتھ کیا۔ ناشتہ کے دوران شیرونی دوبار مہمان خانے میں آئی۔ ہاشم نے تو اس سے نظریں نہ ملائیں لیکن عتبہ کو اس کی قہر آلود نظروں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناشتہ کے بعد عتبہ نے ہاشم کو اشارہ کیا کہ موقع اچھا ہے سلسلہ کلام شروع کرو۔

ہاشم گفتگو کے آغاز کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ذطریق نے خود ہی باتیں شروع کر دیں۔

اس نے بڑی محبت سے پوچھا:

"ہاں اے دارالہجرت کے جوانو! اب بتاؤ۔ سادہ میں تمہارا آنا کس مقصد کے تحت ہے۔ میں سادہ کے ہر شخص سے واقف ہوں۔ لوگ میری عزت کرتے

ہیں۔تمہارے کام کی نوعیت کیا ہے اور کیا مشکل حائل ہے؟''

ہاشم ہمت کر کے بولا:

''ہم سادہ میں آپ ہی سے ملنے آئے ہیں محترم میزبان اور آپ ہی ہماری مشکل آسان کر سکتے ہیں۔''

''بسم اللہ۔'' فطریق جلدی سے بولا۔''میں خدمت کے لئے تیار ہوں''۔

ہاشم نے بات شروع کی:

''بزرگ محترمہ آپ واقف ہوں گے کہ مدینہ میں ایک انصار سردار حباب بن نندر ہوا کرتے تھے۔''

فطریق نے فوراً جواب دیا:

''بھلا حباب بن نندر جیسے عالیشان اور نجیب الطرفین سردار سے کون واقف نہ ہو گا۔الحمدللہ میں انصار ہوں۔مدینہ میں قیام کے دوران میں ان سے کئی بار مل چکا ہوں۔''

ہاشم کو اپنی مشکل آسان ہوتی نظر آئی۔اس نے کہا:

''میرے یہ دوست عتبہ۔انہیں حباب بن نندر کے فرزند ہیں''۔

فطریق خوشی سے بولا:

''ماشااللہ۔پھر تو یہ ہمارے بھی عزیز ہوئے۔''

ہاشم موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جلدی سے بولا۔

اب اس عزیز داری کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لئے میں آپ کی دختر نیک اختر اور عتبہ بن نندر کے عقد کی تجویز پیش کرتا ہوں اگر آپ مناسب سمجھیں تو قبول

فرمائیں ورنہ ہمیں رخصت کی اجات دیجئے۔ ہمارا یہاں آنے کا صرف یہی مقصد تھا“۔

ذطریق سلمی کچھ دیر سوچتا رہا۔اس نے ایک دو بار نظر اٹھا کر عتبہ کو بھی دیکھا۔

ذطریق کی خاموشی طویل ہوئی تو ہاشم نے لقمہ دیا:

”محترم مہربان۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ آپ کو یہ رشتہ منظور نہیں۔آپ بے تکلف انکار کر دیجئے پھر جس خلوص سے آپ ہمیں یہاں لائے ہیں اس محبت سے واپسی کی اجازت دیجئے۔“

ذطریق نے تلے تلے الفاظ میں جواب دیا:

”ایسے معقول رشتے سے انکار کرنا میرے لئے کسی طرح ممکن نہیں۔آپ کے دوست خاندانی شرف اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ انصاری ہیں۔ مجھے اور کیا چاہئے۔اللہ کا دیا میرے پاس سب کچھ ہے لیکن ریا میری اکلوتی اولاد اور لاڈلی بیٹی ہے۔میں اس پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرنا چاہتا۔عقد کے معاملے میں اسے پورا اختیار حاصل ہے۔میں ابھی جا کر اس سے دریافت کرتا ہوں اگر وہ رضامند ہو گئی تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔“

”ضرور.........آپ بیٹی سے ضرور دریافت فرمائیے۔حکم شرعی بھی یہی ہے۔ہاشم نے ذطریق کی ہاں میں ہاں ملائی۔ریا کی مرضی تو اسے پہلے ہی معلوم تھی“۔

ذطریق مہمان خانے سے اٹھ کر حویلی کے اندر گئے۔برآمدے کے سرے پر ہی انہیں شیرونی کھڑی نظر آئی۔شیرونی نے ذطریق کو دیکھ کر گھبرا گئی۔دراصل اس

نے مہمان خانے کے دروازے سے کان لگا کر ان کی پوری گفتگو سن لی تھی۔
فطریق نے شیرونی کو اپنی بیٹی کی طرح پالا تھا۔ شیرونی کے والدین فطریق کی ملازمت میں تھے۔ ان کا انتقال شیرونی کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔

فطریق کو شیرونی کی گھبراہٹ پر کوئی شبہ نہ ہوا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کے بولے۔

''شیرونی۔ تو نے ہمارے مہمانوں کو دیکھا ہے؟''

''جی........''شیرونی نے جواب میں کہا مگر اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں نفرت کا لاوا کھولنے لگا۔

''یہ مدینے کے شریف زادے ہیں۔ ان میں ایک جوان جس کے کاندھے تک بال ہیں اس کا نام عتبہ ہے۔ دوسرا نوجوان ہاشم ہے۔''

شیرونی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ منتظر تھی کہ فطریق کی بات ختم ہو تو وہ منہ کھولے اور ایسی آگ اگلے جس سے ہر بات کا فیصلہ جل کر راکھ ہو جائے لیکن اسے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

ریا نے باپ کو اندر آتے دیکھ لیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ فطریق شیرونی کے پاس پہنچ کر اس سے باتیں کر رہے ہیں تو وہ دھک سے رہ گئی اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ فوراً کمرے سے نکل کر باپ کی طرف بڑھنے لگی۔

شیرونی اپنی زبان میں زہر کے تیر جوڑ رہی تھی کہ ریا اس کے سر پر پہنچ گئی۔ شیرونی نے گھبرا کے ریا کو دیکھا۔

فطریق بیٹی کو دیکھ کر مسکرائے اور ریا کا ہاتھ پکڑ کے اس کے کمرے میں آ

گئے۔

پھر فطریق نے بیٹی کے سامنے بیٹھ کر کہا:

"ریا بیٹی! مجھے تم سے جس قدر محبت ہے اس سے تم واقف ہو۔ تمہاری ماں کو اس دنیا سے گئے ہوئے زمانہ گزرا لیکن میں نے حویلی میں کسی اور عورت کے قدم نہیں آنے دیئے اب ماشاءاللہ تم سمجھدار ہو۔ اپنا نیک وبد دیکھ سکتی ہو۔ لڑکیاں سدا باپ کے گھر نہیں بیٹھی رہتیں۔ میں تمہارے مستقبل کے بارے میں سوچ سوچ کے پریشان ہو جاتا ہوں۔ اللہ نے بڑا کرم کیا اور گھر بیٹھے ایک سبیل پیدا کر دی۔"

فطریق چند لمحے ٹھہر کر پھر بولے:

"اس وقت مہمان خانے میں دو جوان موجود ہیں۔ وہ مدینے کے شریف زادے اور گروہ انصار کے فرد ہیں۔ ان میں ایک نوجوان عتبہ بن حباب ہے اس کے لئے تمہارا رشتہ مانگا گیا ہے۔ میں اس کے خاندان سے پوری طرح واقف ہوں پھر بھی تم اس معاملہ میں آزاد ہو۔ سوچو۔ سمجھو اور بتاؤ کہ میں رشتہ منظور کروں یا انکار کر دوں؟"

ریا پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کے من میں تو لڈو پھوٹ رہے تھے اور وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ باپ کی بات سن کر بولی:۔

"آپ نے مجھے ہر قسم کی آزادی دی ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں اپنا اچھا برا سوچ سکتی ہوں لیکن میں جانتی ہوں کہ باپ اپنی بیٹی کا کبھی برا نہیں چاہتا۔ بزرگوں کی سمجھ جوانوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ آپ کو مدینہ کا شریف

زادہ پسند ہے تو مجھے کوئی انکار نہیں۔آپ جیسا مناسب سمجھیں کیجئے۔ میں آپ کی خوشی میں خوش ہوں۔''

ذطریق نے فطر محبت سے ریا کو سینے لگا کر ہزاروں دعائیں دے ڈالیں۔

ذطریق باہر جاتے ہوئے بولے:

''بیٹی۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونا چاہئے۔ میں ایک دو دن میں اس کام سے فارغ ہوجانا چاہتا ہوں؟''

''جیسی آپ کی مرضی۔ ابا جان۔'' ریا نے سر جھکا کر جواب دیا۔

ذطریق مہمان خانے کے قریب پہنچا تو شیر ونی نہ معلوم کس کونے سے نکل کر ان کے سامنے آ گئی۔اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ذطریق کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اسے دوسری طرف لے گئی۔ذطریق کی سمجھ میں یہ معمہ نہ آیا۔

''شیرونی یہ سب کیا ہے۔تو کیا کہنا چاہتی ہے۔''ذطریق غصے سے بولے مکار شیرونی ہاتھ باندھ کر ذطریق کے سامنے کھڑی ہوگئی اور مردہ آواز میں بولی۔

''آقا۔ میں آپ کی نمک خوار ہوں۔آپ کی خاندانی شرافت سے واقف ہوں اور مجھے ریا بی بی سے بھی حد درجہ محبت ہے اس لئے میں نمک حرامی نہیں کر سکتی۔آپ کو دھوکہ میں نہیں رکھ سکتی۔آپ کو معلوم نہیں کہ جس عتبہ کے ساتھ آپ بی بی ریا کی شادی کرر ہے ہیں اسے ریا نے مدینہ سے خود بلوایا ہے۔جب بی بی ریا مدینہ گئی تھیں تو ان دونوں میں محبت ہوگئی تھی اور انہوں نے شادی کے عہد و پیاں باندھے تھے۔عتبہ اسی واسطے آپ کے پاس آیا ہے.......جو حقیقت تھی وہ میں نے

آپ کو بتا دی۔ میں نے حق نمک ادا کر دیا۔ اب آگے آپ کی مرضی۔ اگر آپ کو میری بات کا اعتبار نہ ہو تو ریا سے خود جا کر پوچھ لیجئے۔''

یہ سن کر فطریق کی رگوں میں خون کھولنے لگا۔ اس دور میں عرب سب کچھ برداشت کر لیتے تھے لیکن اس جوان سے بیٹی نہیں بیاہتے تھے جس سے لڑکی کو محبت ہو۔ یہ ان کے خاندان کی سب سے بڑی توہین تھی۔''

فطریق غصہ سے کانپتا ہوا ریا کے پاس پہنچا۔

ریا بے چاری غصے میں بھرا چہرہ دیکھ کر گھبرا گئی۔ فطریق کی آنکھیں لال اور تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ ریا سمجھ گئی یہ سب کچھ کیا دھرا شیرونی کا ہے۔

فطریق نے تقریباً چیختے ہوئے کہا:

''ریا تو نے میری دی ہوئی آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ میں کیا جانتا تھا کہ تو عتبہ کو پہلے سے جانتی تھی اور مدینہ میں اس سے مل چکی ہے۔ اب یہ شادی کسی صورت میں ہو سکتی خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ میں خاندان میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ میں ابھی جا کر صاف صاف جواب دیتا ہوں اور انہیں حویلی سے باہر نکالتا ہوں۔''

ریا نے دیکھا تو وہ بڑے حوصلے سے بولی:

''ابا جان۔ نہ میں نے آج تک آپ سے گستاخی کی ہے اور نہ اب کرنا چاہتی ہوں۔ میں آپ کی بیٹی ہوں اور ہر معاملے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ اس رشتے کو بھاڑ میں ڈالئے لیکن غصے میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھایئے جس سے میں بدنام ہو جاؤں اور آپ کو بھی خاندان والوں کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑے۔

انکار کے سو بہانے ہوتے ہیں۔ اگر آپ نے انکار کر دیا اور انہیں ذلیل کر کے گھر سے نکالا تو یہ لوگ مدینہ جا کر آپ کو اس قدر بدنام کریں گے کہ آپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جائیں گے۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ ایسی تہذیب اور شائستگی سے انہیں ٹالیے کہ آپ کے اخلاق پر حرف نہ آئے''۔

ریا کی دلیلوں نے فطریق کو قائل کر دیا۔ اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ بولا:

''بیٹی تو ٹھیک کہتی ہے۔ انصار کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ گھر آئے مہمان سے کج خلقی اور بے مروتی کا مظاہرہ کریں''۔

ریا نے فوراً کہا:

''ابا جان جب آپ کو عرب کے رسم و روج کا اتنا خیال ہے تو اپنی خاندانی شرافت اور تہذیب کو بھی ہاتھ سے دینا پسند نہیں کریں گے''۔

''ٹھیک ہے بیٹی۔ میں اپنے سر کوئی الزام لینا نہیں چاہتا'' فطریق نے ریا کی باتوں سے اتفاق کیا۔ ''مگر اب انہیں میں کس طرح جواب دوں؟''

ریا نے باپ کو مشورہ دیا:

''آپ بظاہر رشتہ منظور کر لیں لیکن نکاح کے لئے اتنی کڑی شرطیں لگا دیں جنہیں پورا کرنا ان کے لئے قطعی ممکن نہ ہو'' فطریق بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا:

ریا تیرا مشورہ بالکل درست ہے۔ میں ان سے اتنا مہر مانگوں گا کہ وہ دے ہی نہ سکیں۔

فطریق بیٹے کے پاس سے اٹھ کر مہمان خانہ میں آیا۔ وہ راستے پر نکاح کے لئے سخت سے سخت شرطیں سوچتا رہا۔ عتبہ اور ہاشم اس کا انتظار کر رہے تھے۔

فطریق آتا دیکھ کر وہ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔

فطریق نے بیٹھتے ہوئے ہاشم کو مخاطب کیا:

''ہاشم میری بیٹی کو عتبہ سے عقد منظور ہے لیکن عقد کے لئے چند شرطیں ہیں جنہیں پورا کرنا لازمی ہوگا۔''

ہاشمی خوشی سے بولا:

''فرمایئے محترم۔ جہاں تک ہو سکا شرطیں پوری کریں گے''۔

فطریق نے کہا:

''میں نے یہ شرطیں ریا کی خوبیوں کے لحاظ سے مقرر کی ہیں۔آپ جانتے ہیں میری بیٹی کوئی معمولی لڑکی نہیں۔اس کے مہر میں ایک ہزار اشرفیاں نقد دینا ہوگی۔''

''شرط پوری ہوگی۔''ہاشم نے فوراً تسلیم کر لیا۔

''اور پانچ ہزار روپے''فطریق نے دوسری شرط بیان کی۔

''ادا کر دیئے جائیں گے۔''ہاشم نے اسے بھی تسلیم کر لیا۔

''ایک سو نفیس اور اعلیٰ چادریں۔''یہ تیسری شرط تھی۔

ہاشم نے بغیر حجت یہ بھی تسلیم کر لی۔

فطریق کو بڑا تعجب ہوا۔اس نے سوچا یہ تو تمام شرطیں مانتے چلے جا رہے ہیں۔پھر بہت سوچ کے بعد اس نے کہا۔

''آخری شرط یہ ہے کہ عقدے کے موقع پر عنبر پھر سیاہ عنبر تو خود ہی بہت قیمتی اور نایاب ہے۔

بس اس نے کہا:

''اس شرط سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مہذب طریقے سے انکار کر رہے ہیں۔عنبر اشہب کی ایک ٹکیہ کئی ہزار اشرفیوں میں دستیاب ہوتی ہے۔پانچ ٹکیوں کا مہیا کرنا ایک ناممکن سی بات ہے۔''

فطیق نے مسکرا کر کہا:

''میں نے شرطیں بیان کر دیں۔ان تمام چیزوں کو مہیا کئے بغیر ریا کا عقد نہیں ہو سکتا''۔

اور فطریق بڑی بے اعتنائی سے اٹھ کر جانے لگا۔

ہاشم نے آوازدی:

''ذرا ٹھہرئے محترم! آپ وعدہ کیجئے کہ اگر میرا یہ دوست تمام شیزیں آپ کے سامنے پیش کر دے تو پھر آپ کو اپنی بیٹی کے عقد میں کوئی عذر نہ ہوگا۔''

فطریق ذرا گھبرایا۔عرب وعدے کے بہت پابند ہوتے ہیں۔پھر اس نے دل میں سوچا۔عنبر اشہب کی پانچ ٹکیاں تو یہ قیامت تک نہ لا سکیں گے۔

اب فطریق نے صاف طور پر وعدہ کیا:

''بے شک میں وعدہ کرتا ہوں کہ جس دن آپ کے یہ دوست تمام چیزیں لے کر میرے پاس آئیں گے میں اسی دن ریا کا نکاح ان کے ساتھ کر دوں گا۔''

آخر میں ہاشم نے اجازت مانگی:

''اچھا تو پھر ہمیں اجازت دیجئے۔میرا دوست جلد ہی آپ کے پاس آئے گا''۔

فطریق نے انہیں روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔عتبہ اور ہاشم بھی اب وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے۔انہوں نے اپنا سامان گھوڑوں اور اونٹوں پر بار کیا۔ فطریق نے ان کی روانگی سے پہلے ہی حویلی چلا گیا۔

چلتے وقت عتبہ اور ہاشم نے حویلی کے دروازے پر آخری نظر ڈالی۔

دروازے کے عین درمیان میں شیرونی کھڑی مسکرا رہی تھی۔



عتبہ اور ہاشم مدینہ پہنچ گئے اور انہوں نے مطلوبہ شیزوں کے حصول کے لئے کوشش شروع کردی۔اشرفیوں اور ریپوں کے حصول میں تو کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ کچھ کا انتظام عتبہ نے کیا۔باقی رقم ہاشم نے فراہم کردی۔یمنی چادریں بھی کسی نہ کسی طرح خرید لی گئیں۔اب سوال عنبر اشہب کی خریداری کا تھا۔ہاشم رئیس زادہ تھا مگر اتنا بھی نہیں کے عنبر کھلے بازار سے خرید سکے۔عنبر کی خرید کے لئے کئی ہزار اشرفیوں کی ضرورت تھی جو ا کیلے ہاشم کے بس کا کام نہیں تھا۔

عتبہ اور ہاشم کو ایک پریشانی تو یہ تھی دوسری مصیبت ہاشم کی شادی تھی۔ہاشم کی شادی طے ہو چکی تھی اور اگر ہاشم سادہ نہ جاتا' تو اب تک اس کی شادی بھی ہو چکی ہوتی۔

جب سے ہاشم واپس آیا تھا۔اس کے والد برابر زور دے رہے تھے کہ یہ فرض جس قدر جلد ممکن ہو ادا کردیا جائے لیکن یہ ہاشم ہی تھا جو ٹال رہا تھا۔وہ جانتا تھا کہ اگر وہ اپنی شادی کے انتظامات میں الجھ گیا تو عتبہ کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے

گا۔ ادھر لڑکی والے بہت زور دے رہے تھے۔ ہاشم عجب پریشانی میں مبتلا تھا۔ پیہم ٹال مٹول سے ہاشم کے والد کو کچھ اور ہی بدگمانی پیدا ہوگئی تھی۔

ایک دن جب عتبہ اور ہاشم، بیٹھک میں بیٹھے عنبر اشہب کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس وقت ہاشم کے والد بڑے غصے سے بیٹھک میں داخل ہوئے اور تیز آواز میں بولے:

''ہاشم! آج میں تم سے ایک فیصلہ کرنے آیا ہوں''

ہاشم سمجھ گیا مگر اس نے جواب دینے کے بجائے اپنا سر جھکا لیا:

''تمہیں صاف صاف بتانا ہوگا کہ تم شادی سے کیوں ٹال مٹول کر رہے ہو؟''

ہاشم نے جی کڑا کیا مگر آہستہ سے کہا:

''ابا جان آپ کے حکم کی تعمیل میں ضرور کروں گا مگر ایک ذرا سی پریشانی ہے۔ وہ ختم ہو جائے تو پھر جیسا آپ کہیں گے میں کرون گا۔''

''عتبہ کی شادی کب ہو رہی ہے؟'' ہاشم نے کے والد نے پوچھا۔

''جب مہر کا بندو بست ہو جائے گا۔ عتبہ کے خسر نے مہر میں اتنی قیمتی چیز مانگی ہے جس کا انتظام نہیں کر سکتا۔''

''کیا چیز مانگی ہے؟'' ہاشم کے والد نے پوچھا۔

ہاشم نے سر اٹھا کر جواب دیا:

''عنبر اشہب کی پانچ قرص (ٹکیاں)''

''پانچ قرص۔'' ہاشم کے والد کبھی ہاشم کو اور کبھی عتبہ کو دیکھتے۔

ہاشم نے معصومیت سے کہا:

''دیکھئے نا ابا جان۔ اگر پانچ قرص عنبر اشہب مجھ سے مانگی جاتیں تو شاید آپ بھی اس کا انتظام نہ کر پاتے''۔

ہاشم کے والد سوچ میں پڑ گئے۔ ہاشم ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر غور و فکر کے بعد ہاشم نے معصومیت سے کہا۔

''ابا جان۔ اگر پانچ قرص عنبر اشہب کے میری شادی کے لئے طلب کئے جاتے تو شاید آپ بھی اس کا انتظام نہ کر پاتے۔''

ہاشم کے والد پہلے ہی فکر مند تھے۔ بیٹے کی بات نے انہیں فکر میں ڈبو دیا۔

آخری بڑی غور و فکر کے بعد انہوں نے کہا۔

''عتبہ کی شادی کے بعد تو تمہیں اپنی شادی سے انکار نہ ہوگا۔''

''ہرگز نہیں ابا جان۔'' ہاشم جلدی سے بولا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں''۔

''اچھا تو جاؤ اور سانڈنی تیار کراؤ۔ میں اسی وقت مکہ روانہ ہو جاؤں گا۔''

ہاشم کے والد یہ حکم دے کر بیٹھک سے نکل گئے اور ہاشم نے عتبہ کو گلے لگا لیا

-

''مبارک ہو دوست۔ تمہارا کام بن گیا۔''

اور عتبہ کی آنکھوں سے شکر گزاری کے آنسو ٹپک پڑے۔

عتبہ اور ہاشم نے تین راتیں آنکھوں میں کاٹ دیں۔ پھر چوتھے دن انہوں نے ہاشم کے والد کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھا تو ان کی بھی باچھیں کھل گئیں۔

ہاشم کے والد نے عنبر اشہب کی پانچ قرص عتبہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا:

''عتبہ۔اللہ کے کرم اور میری کوشش سے تمہاری ضرورت پوری ہوگئی مگر اب میری بھی ایک خواہش ہے۔امید ہے تم اسے ضرور پورا کرو گے۔؟''

عتبہ نے احسان مندی سے سر جھکاتے ہوئے کہا:

''چچا جان! آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اسے میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔آپ حکم دیجئے۔میں آپ کی خواہش پر قربان ہونے کو تیار رہوں''۔

ہاشم کے والد بولے:

''تم ہاشم کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش نہ کرو گے۔یہ میری خواہش بھی ہے اور درخواست بھی۔''

عتبہ پریشان ہو گیا لیکن اسے اپنے محسن کی مخالفت کی ہمت نہ ہوئی۔اس نے کہا:

''چچا جان آپ فکر نہ کریں۔میں سادہ اکیلا ہی جاؤں گا۔''

ہاشم کے والد حساب لگاتے ہوئے بولے:

''ہم ہاشم کی شادی تین ماہ بعد کریں گے۔امید ہے اس وقت تک تم واپس آجاؤ گے۔''

عتبہ نے تائید کی:

''ضرور چچا جان۔میں اس سے بھی پہلے واپس آجاؤں گا۔''

عتبہ نے خود ہی اس کے باپ کی بات مان لی تھی پھر ہاشم کیوں مخالفت کرتا۔وہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔

ہاشم نے عتبہ کو مہر کے تمام سامان کے ساتھ رخصت کیا۔ہاشم کے والد نے

احتیاطاً طور پر اپنے چار آدمی بھی ساتھ کر دیئے۔ عتبہ منزلیں مارتا ہوا بغیر کسی دشواری کے سادہ پہنچ گیا۔

پھر ایک صبح عتبہ نے فطریق سلمیٰ کی حویلی پر پہنچ کر اپنے آنے کی اطلاع اندر بھجوائی۔

فطریق بھاگا ہوا آیا اور عتبہ کو دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ وہ تو اسے بھول چکا تھا۔ عنبر اشہب کی پانچ قرص لانے کا تو وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

فطریق نے پہلا سوال یہی کیا۔

''مہر کی چیزیں لے کر آئے ہو؟''

عتبہ نے بڑے فخر سے جواب دیا:

''جی ہاں۔ ایک ہزار اشرفیاں پانچ ہزار چاندی کے سکے۔ برو یمانی کی ایک سو نفیس چادریں اور عنبر اشہب کی پانچ قرص بھی لایا ہوں۔''

فطریق کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ الٹے پیر بیٹی کے پاس آیا۔

''کیا ہوا ابا جان؟'' بیٹی نے باپ کو پریشان دیکھ کر سوال کیا۔

''غضب ہو گیا بیٹی!'' فطریق گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''عتبہ واپس آ گیا ہے اور مہر کی تمام چیزیں لے کر آیا ہے۔ اب میں کیا کروں؟''

ریا دل میں تو بہت خوش ہوئی مگر سنجیدہ صورت بنا کر بولی:

''آپ نے اس سے صاف الفاظ میں اقرار تو نہیں کیا تھا۔ میرا مطلب ہے کوئی یقینی وعدہ تو نہیں کیا تھا؟''

''مشکل تو یہی ہے بیٹی۔ میں نے صاف لفظوں میں اقرار کیا تھا اور وعدہ

بھی۔اب میں اپنی زبان سے نہیں پھر سکتا۔ مجھے اپنا عہد پورا کرنا ہوگا۔“

ریا نے ٹکڑا لگایا۔سر جھکا کر بولی:

”جی ہاں یہ بدعہدی تو آپ سے نہ ہو سکے گی۔انصاری ایسا نہیں کر سکتے۔“

فطریق نے سنبھل کر کہا:

”ہاں بیٹی! وعدہ خلافی نہ ہمارے خاندان میں ہوئی ہے اور نہ مجھ سے ہو
سکے گی۔تو دلہن بننے کی تیاری کر۔ شاطاؤں کو بلا لے۔عقد آج ہی ہوگا۔ میں اپنا
سکے گی۔تو دلہن بننے کی تیاری کر۔ شاطاؤں کو بلا لے۔عقد آج ہی ہوگا۔ میں اپنا
عہد پورا کروں گا۔“

فطریق نے باہر آکر عتبہ کو بڑی عزت سے مہمان خانہ میں اتارا۔ریا نے باپ کے حکم کی تعمیل میں دلہن بننا شروع کیا۔عجیب بات یہ تھی کہ شیرونی حویلی میں کہیں نظر نہ آ رہی تھی۔ریا نے اسے بہت ڈھونڈا لیکن وہ کہیں نہ ملی۔ریا سمجھ گئی کہ شیرونی کو یہ شادی پسند نہیں۔اس لئے حویلی چھوڑ بھاگی ہے۔

شام کو عقد ہوا۔پھر وہ رات بہاریں لے کر آئی۔ریا اور عتبہ نے ہنستے بولتے سویرا کر دیا۔عتبہ کو ریا کا ملنا ایک انہونی بات تھی مگر وہ ہو کر رہی۔عتبہ اپنی قسمت پر جس قدر ناز کرتا کم تھا۔

صبح ہوتے ہی عتبہ نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔وہ ریا کے ساتھ اپنے پیارے دوست ہاشم کی شادی میں شریک ہونا چاہتا تھا۔عتبہ نے ہاشم کے بارے میں ریا کو سب کچھ بتا دیا تھا۔

ولیمہ کے بعد فطریق نے اپنی طرف سے سادہ والوں کی دعوت کی۔پورے

قصبے کو مدعو کیا گیا۔ اس کے جواب میں سادہ والوں نے عتبہ اور ریا کی دعوت کی۔ دونوں طرف سے دعوتوں کا سلسلہ چل چکا۔ عتبہ نے سادہ سے نکلنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ڈیڑھ ماہ سے پہلے مدینہ روانہ نہ ہو سکا۔

عتبہ کی روانگی کے دن جشن جیسا سماں تھا۔ پورا قصبہ فطریق کے گھر اُمڈ آیا۔ فطریق نے جو جہیز اپنی اکلوتی بیٹی کو دیا وہ الگ رہا۔ قصبے والوں نے اس قدر تحائف دیئے کہ عتبہ کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔

آخر فطریق نے بیٹی کو بچشم نم رخصت کیا۔ مدینہ جانے والا یہ قافلہ بہت بڑا تھا۔ قافلہ کے ساتھ محافظ سوار تھے اور قافلہ کے کئی جوان بھی مسلح ہو کر ان میں شامل ہو گئے تھے مگر کسی نے کیا سچی بات کہی ہے۔

تدبیر کند ابندہ تقدیر کند خندہ

(انسان تدبیر کرتا ہے مگر تقدیر ہنستی ہے)

فطریق نے تو ایک بڑے قافلے کے ساتھ بیٹی کو روانہ کیا تھا۔ کسی خطرے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ پر ہونے والی ہو کر رہتی ہے۔ قافلہ اپنی منزل مقصود سے صرف ایک دن کے فاصلہ پر تھا کہ اسے ڈاکوؤں نے آن گھیرا۔

ڈاکوؤں کو پتہ لگ گیا تھا کہ اس قافلہ کے ساتھ ایک دولہا دولہن جا رہے ہیں جن کے پاس بہت مال و دولت ہے۔

پس ڈاکوؤں کا حملہ ہوا تو قافلے کے مسلح جوان اور محافظ مقابلے پر ڈٹ گئے۔ عتبہ بھی تلوار کھینچ کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ شدید لڑائی شروع ہو گئی۔ قافلے میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ ڈاکو تعداد میں بہت زیادہ تھے

جن کی محافظ تاب نہ لا سکے۔بہت سے زخمی ہو کر گر گئے۔

عتبہ بڑی بہادری سے لڑ رہا تھا۔ڈاکوؤں نے اسے گھیر لیا اور نیزے مار مار کے گھوڑے سے گرا دیا۔عتبہ کے زمین پر گرتے ہی کئی نیزے اس کے سینے میں پیوست ہو گئے۔عتبہ نے مرتے مرتے ریا کو آواز دی۔ریا محمل میں سوار تھی۔اس نے جو عتبہ کو گھوڑے سے گرتے دیکھا تو چیخ مار کر محمل سے کود پڑی۔وہ روتی پیٹتی شوہر کی لاش پر پہنچی اور اس طرح بین شروع کیا کہ زمین و آسمان کانپ اٹھے۔اس نے کپڑے پھاڑ ڈالے اور بال نوچ لئے۔

ڈاکوؤں نے کسی عورت کو اس قدر بیتابی سے روتے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔وہ دم بخود کھڑے ریا کو دیکھ رہے تھے پھر ان ظالموں کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔پھر کیا قافلے والے اور کیا ڈاکو سب ہی ریا کے گرد آ کر کھڑے ہو گئے اور خود بھی ان کے ساتھ رونے لگے۔

اور پھر ریا اپنے سینے پر دوہتڑ مار کر عتبہ کی لاش پر ایسی گری کہ پھر نہ اٹھ سکی۔اس کی صرف ایک سسکی ہی سنائی دی اور اس کی روح عتبہ کی روح سے جا ملی۔

اس منظر کو دیکھ کر ڈاکوؤں کی بھی چیخیں نکل گئیں۔انہوں نے لوٹا ہوا تمام مال نقد و جنس سب کا سب قافلے والوں کو واپس کر دیا۔

اور

پھر اس کے بعد ایک قبر کھود کر عتبہ اور ریا کو انہیں کپڑوں میں ایک ساتھ ایک ہی قبر میں سپرد خاک کر دیا۔

اس المناک حادثہ کی خبر مدینہ پہنچی تو پورے شہر میں کہرام مچ گیا۔ہاشم کا

حال سب سے برا تھا۔ عتبہ کو آنے میں دیر ہوگئی تھی۔ اس لئے اس کی شادی ہو گئی۔ یوں ہاشم اس کی بیوی اور ہاشم کے والد بھی عتبہ کی قبر پر آئے۔

خدا کی قدرت دیکھئے کہ تین دن کے مختصر عرصہ میں عتبہ اور ریا کی قبر کے سرہانے ایک ہرا بھرا پودا اگ آیا۔ ہاشم نے بالیں پر جھک کر تازہ پتوں کو بوسہ دیا۔

ہاشم کی بیوی نے کہا:

''یہ پودا عتبہ اور ریا کی محبت کی یادگار ہے''۔

ہاشم نے اک آہ سرد بھر کر کہا:

''جی ہاں یہ شجرۃ العروسین ہے۔''

پھر وہ درخت اور وہ مقام شجرۃ العروسین (دولہا دولہن کا درخت) کے نام سے مشہور ہو گیا۔

لوگ ادھر سے گزرتے تو اس درخت کو دیکھ کر انہیں محبت اور وفا کی یہ داستان یاد آ جاتی۔

اس عظیم الشان اور دردناک رومان کے بعد ہم ایک بار پھر اپنے اصل موضوع یعنی سلطنت غوریہ (سلطان شہاب الدین غوری) کی داستان کی طرف واپس آتے ہیں۔ گذشتہ کہانیوں اور داستانوں میں ہمیں بعض ایسی عبرتناک باتیں اور خدا کی قدرت کے ایسے حیرت انگیز نمونے نظر آتے ہیں کہ ان کا نقش دل پر بہت گہرا پڑتا ہے اور مٹائے نہیں مٹتا۔ ملکہ نور جہاں بیگم جس کا نام کبھی ہندوستان کے سکے پر نقش تھا اور جو ملک اور ملت کے سیاہ وسفید کی مالک تھی اس کی پیدائش کا واقعہ بار ہا عبرت انگیز الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جس سے تقریباً تمام ناظرین

واقف ہوں گے اور حیرت کرت ہوں گے کہ جب خدا کسی پر مہربان ہوتا ہے اور اسے کچھ دینے پر آتا ہے تو کیسے کیسے حیرت انگیز طریقوں سے اس کی مدد اطاعت کرتا ہے اور جب کسی کو بگاڑنا چاہتا ہے تو کس طرح وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر منہ پیٹتا ہے۔

سلطنت غوریہ کے حالت تاریخ کے صفحات پر درج ہیں اور مورخین کے قلم اس بات کے شاہد ہیں کہ سلطان معز الدین غوری و سلنا غیاث الدین غوری کے کارنامے کیسے عروج و اقبال کے مناظر پیش کرتے ہیں۔ مگر پیش کرتے ہیں۔ مگر شاید اس پر غور نہ کیا ہوگا کو آخر "غوری" کون تھے اور اس عروج و مرتبہ سے پہلے کس سطح پر رہتے بستے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ضحاک تازی جس نے قدیم الایام اور ایران کی ابتدائی تاریخ میں اہل عجم کو عرب کی شجاعت اور سپہ گری کا مزہ چکھایا تھا اس کے دونوا سے سوری اور سام نزیدوں کی ملازمت میں تھے جب ضحاک سے وابستہ لوگوں کا قلع قمع ہوا اور کوشش شروع ہوئی کہ اس کی نسل ہی صفحہ ہستی سے مٹادی جاتے تو وہ دونوں بھائی دربار خریدوں سے نہاوند میں پناہ گزیں ہوئے۔ وہاں سام کے بیٹے شجاع کی شادی سوری کی بیٹی سے ہوگئی۔

اتفاقاً چچا جو خسر بھی تھا اپنے داماد بھتیجے کے خون کا پیاسا ہوگیا' شجاع کو یہ حال اپنی ہمدم اور ہمراز بی بی سے معلوم ہوا تو وہ بال بچوں کو لے کر نہاوند سے بھاگا اور کوہستان غور میں آکر اقامت اختیار کی۔ یہاں اس کی اولاد بڑھی' پھیلی اور اس سرزمین کی حکومت اس کے ہاتھ میں رہی۔ آخر اسی نسل کا ایک شخص جس کا نام

شنسب بتایا گیا ہے حضرت علی مرتضیٰؓ کے زمانہ میں خلعت اسلام سے سرفراز ہوا اور اس کی نسبت سے یہ نسل بعد کے زمانہ میں شنسی کے لقب سے مشہور رہوئی اور اس کا یہ فخر بہت بجا ہے کہبنی امیہ کے زمانہ میں جب اسلام پر اہل بیت نبوت کی شان میں شب وشتم (گالی دینا) کے الفاظ کہے جاتے تھے' ان لوگوں نے کبھی حضرت علیؓ ابن ابھی طالب کی کونسل کو بیہودہ اور ناپاک الفاظ سے یاد نہیں کیا۔ حتیٰ کہ ابومسلم خراسانی جب اپنا سیاہ جھنڈا بلند کر کے بنوامیہ کے استقبال کے لئے اٹھا تو اس خاندان کا بہادر سردار فولاد شنسی اس کے ساتھ تھا۔

سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں بھی یہ خاندان بدستور اپنی مملکت پر متصرف رہا۔ صرف اتنا ہوا کہ محمود نے ابوعلی محمو بن سوری کو اپنی طرف سے وارث تخت غور قرار دیا۔ ابوعلی مذکور کے عباس نام کے ایک بھتیجے نے اسے آبائی ریاست سے محروم کر کے تاج وتخت پر قبضہ کرلیا اور کہتے ہیں کہ اس کی اس غاصبانہ کارروائی پر یہ غضب الٰہی نازل ہوا کہ سات سال تک علاقہ غور میں پانی برسا اور سخت قحط پڑ گیا۔ اور اس سے زیادہ یہ قیامت تھی کہ سات برس تک اس مملکت میں انسان تو انسان مویشیوں تک کے بچے نہ ہوئے۔ آخر اسے سلطان ابراہیم غزنوی نے ایک معرکہ میں شکست دے کر قید کرلیا اور اس کا بیٹا محمد بن عباس شنسی کی نسل سے یہ تمام شاہان غور رہیں۔

قطب الدین اور شاہان غزنویہ کے درمیان جنگ ہوئی جس میں اس کی حکومت جاتی رہی اور سارے علاقے پر دولت غزنویہ کا قبضہ ہو گیا۔ قطب الدین کا بیٹا سام اپنے ملک' خاندان اور قوم کی تباہی کا تماشہ دیکھ کر ہندوستان کی طرف

بھا گا اور وہاں جا کر تجارت کرنے لگا۔ اب اگر غور سے دیکھا جائے تو اکیلا یہی ایک شخص اس پرانے خاندان کی یادگار ہے اور اسی کی نسل سے وہ سلاطین عظام پیدا ہوئے جو آئندہ ہندوستان سے لے کر حدودِ عراق تک ساری دنیا کے مالک ہوئے جن کے آگے بڑے بڑے سرکشوں اور زبردست سے زبردست تاجداروں کے سر جھکے ہوں گے مگر وہ تو جب ہوگا ہوگا۔ سر دست یہ دیکھو کہ اس وقت یہ غریب کس حالت میں ہے اور کیسی مصیبتیں جھیل رہا ہے۔

وہ ہندوستان کے شہروں میں تجارت کر رہا تھا کہ اسے وطن یاد آیا۔ ایک آہ کلیجے سے نکلی اور کسی دلدوز تیر کی طرح کلیجے ہی میں ٹوٹ کے رہ گئی۔ دل میں آیہ کہ چاہے جو کچھ ہو ذرا وطن کی صورت تو چل کے دیکھ آؤ۔ بس بال بچوں کو ایک کشتی میں سوار کیا۔ دریائے سندھ اور دریائے کابل کا چڑھاؤ کاٹتا ہوا دریا کے راستے سے وطن کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک ایسی آندھی آئی کہ کشتی تباہ ہو کے ڈوب گئی اور دیدارِ وطن کے عوض ان مصیبت زدہ آرزومندوں نے قعرِ دریا میں آنکھیں بند کیں اور خوابگاہِ عدم میں جا پہنچے صرف سام کا ایک بیٹا اعزاز الدین حسین اتفاقاً بچ گیا۔ کوئی موقوہ ہوتا تو شاید وہ خودکشی پر آمادہ ہو جاتا مگر مصیبت جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو انسان کو سب باتیں بھول جاتی ہیں اور سوائے اپنی جان بچانے کے کچھ یاد نہیں رہتا۔

اتفاق سے ایک ٹوٹا تختہ نوعمر اعزاز الدین حسین کے ہاتھ آ گیا اور فوراً اس پر بیٹھ گیا کہ شاید جان بچ جائے۔ خدا کی قدر۔ سیلاب کی شدت اور طوفان کی مصیبت سے ایک شیر بھی دریا میں ہاتھ پاؤں مارتا اس تختے کے قریب پہنچا اور وہ بھی اس

تختے پر نہایت مسکین صورت بنا کر آ بیٹھا۔ اس طرح اعزاز الدین اور وہ شیر تین رات دن تک بھوکے پیاسے ہم صحبت اور بے آزار رفیق سفر رہے۔ اب اس تختے کو ہوا اور موجوں نے کنارے جا لگایا تو دونوں کی جان میں جان آئی۔ شیر نے تختے سے کود کر جنگل کی راہ لی اور اعزاز الدین حسین آبادی کی تلاش میں روانہ ہوا۔

کچھ عرصہ اس دشت نوردی میں گزر رہا تھا کہ ایک شہر نظر آیا۔ اعزاز الدین حسین دن بھر اس شہر کے گلی کوچوں میں خاک اڑاتا پھرا اور رات ہوئی تو خانماں برباد غریب الوطنوں کی طرح ایک دوکان کے تھڑے پر پڑ کے بھوکا پیاسا سو گیا۔ رات کو کوتوال شہر اپنے چند ماتحوں کے ساتھ ادھر سے گزرا اور ایک اجنبی کو اس دکان میں خراٹے لیتے دیکھ کر ٹھہرا اور دل میں سوچا کہ یہ شاید کوئی چور ہے اور چوری کے فراڈ میں یہاں آ کر سو گیا ہے۔ کوتوال کے دل میں یہ خیال آیا تو پھر اسے کون بچا سکتا تھا فوراً اسے گرفتار کر لیا گیا اور معمولی تحقیقات کے بعد اس غریب کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

بے گناہ اعزاز الدین حسین پورے سات سال تک اس قید خانے میں رہا۔ جبکہ اس کے حال پر نہ کوئی رونے والا تھا اور نہ اسے بچانے والا۔ آخر حاکم شہر کی سخت مرض میں مبتلا ہوا۔ جہاں حصول شفا کی اور تدبیریں کی گئیں وہاں کچھ قیدی بھی آزاد کر دیئے گئے۔ اس کی قسمت نے یاوری کی کہ وہ اس بہانے وہاں سے چھوٹا۔

غزنی کے اطراف میں ان دنوں تاخت و تاراج اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا اور اکثر مسافروں کو لٹیرے اور راہزن لوٹ لیا کرتے تھے۔ اعزاز الدین تنہا چلا

جاتا تھا کہ رہزنوں کے ایک گروہ سے دوچار ہوا۔ رہزنوں نے اعیز از الدین کو خوشرو، نوعمر اور اچھے قد وقامت کا جوان دیکھا تو خاطر داری کر کے اپنے ساتھ لے گئے اور اسے دوست بنالیا۔ اسے ایک عمدہ گھوڑا اور اسلحہ دیا اور لوٹ مار کے لئے روانہ ہوئے۔

اتفاق یا قسمت جس رات اعزاز الدین حسین کا اور ڈاکوؤں کا ساتھ ہوا اسی کی صبح کو وہ سب ڈاکو شاہی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے کیونکہ ان ڈاکوؤں کا سے عوام اور خواص سب ہی عاجز اور پریشان تھے۔ یہ سلطان ابراہیم غزنوی کا زمانہ تھا۔ یہ تمام ڈاکو شاہی دربار میں پیش ہوئے اور انہیں واجب القتل قرار دیا گیا۔ دو چار روز اس حکم کی تعمیل شروع ہوئی۔ عام پبلک کے مجمع میں ایک ڈاکو کو آنکھوں پر پٹی بنادھ کر لایا جاتا اور جلاد اس کا سر اڑا دیتا تھا۔

اعاز الدین حسین نے اس وقت تک صبر وشکر کے ساتھ مصائب برداشت کئے تھے مگر اب اس سے صبر نہ ہو رہا تھا۔ پس جب جلاد اسے قتل کے لئے لایا اور آنکھوں پر پٹی باندھنے لگا تو بے اختیار اعزاز الدین کے آنسو جاری ہو گئے اور ایک آہ دلروز کے ساتھ یہ الفاظ پر آئے:

''خداوندا! جانتا ہوں کہ تجھ سے غلطی نہیں ہوسکتی اور تیری ذات پاک ظلم وجور سے مبرا ہے لیکن آخر میں بے گناہ کیوں مارا جارہا ہوں؟''

اس پر جلاد نے کہا:

''تم اور بے گناہ۔ مدتوں رہزنی کر چکے ہو، لوگوں کو لوٹتے مارتے رہے۔ سلطان وقت سے سرتابی کرتے رہے پھر بھی خود کو بے خطا اور بے قصور سمجھتے ہو۔''

اعزازالدین نے جواب دیا:

''مجھ سے تو کل رات ان لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی بس۔ البتہ اتنا ضرور قصور ہوا کہ ان کے ساتھ پکڑا گیا حالانکہ میں قطعاً نہیں جانتا کہ یہ کون لوگ تھے۔ ان کے کیا افعال تھے اور یہ لوگ کن گناہوں میں گرفتار رہے ہیں۔''

اس سلسلے میں اس نے اپنی پوری روداد جلاد کو سسک سسک کے سنائی۔ جلاد کو اس کی داستان سن کر ترس آ گیا۔ وہ فوراً اپنے افسر کے پاس دوڑا ہوا گیا اور کل حال بیان کر دیا۔ افسر کے دل میں خدا نے کچھ ایسی نیکی ڈال دی کہ اس نے یہ کیفیت سلطان ابراہیم غزنوی کے حضور جا کر بیان کر دی۔ سلطان کو سخت تعجب ہوا اس نے اعزازالدین کو اپنے سامنے بلویا اور اس کی پوری سرگزشت اس کی زبانی سنی۔

اس پر درد داستان نے بادشاہ پر اس قدر اثر کیا کہ اس نے فوراً اس کی جاں بخشی کر دی۔ پھر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اسے وہاں خاندانی شرافت کے آثار نظر آئے تو اپنے دربار میں رکھ کے اس کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا۔ تعلیم کی برکت اور اثر سے اس کے جوہر شرافت چمکنے لگے۔ پس اسے عزت دے کر مقربین دربار میں شامل کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی ''عرض بیگی'' اور ''حاجت'' کی خدمت اس کے سپرت کی۔ آخر حسن خدمت اور ادب اور شائستگی کی بدولت وہ یہاں تک بادشاہ کا منظور نظر ہوا کہ ایک شاہی خاندان کی لڑکی اس کے نکاح میں دی گئی۔ جس کے بعد اس کی عزت وعظمت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔

پھر اعزازالدین کو اس قدر عروج حاصل ہوا کہ زمانہ نے سلطنت کا ورق

الٹا۔ سلطان ابراہیم غزنوی آغوش لحد میں سویا اور تخت سلطنت پر سلطان مسعود بن ابراہیم غزنوی جلوہ افروز ہوا مسعود مرحوم باپ سے زیادہ اعزاز الدین پر مہربان تھا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اسے غور کا والی اور حکمران مقرر کر دیا۔ انقلاب زمانہ دیکھئے کہ جس ملک کی سرزمین کو دیکھنے کے لئے اس کے خاندان والے رات دن کوشاں رہتے تھے اس وطن میں حاکم اور تمام سیاہ وسفید کا مالک بن کے پہنچا۔ جس کی دید کی آرزو میں اس کے والدین اور سارے خاندان کو سوائے نامرادی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔

اعزاز الدین حسین کو اس غزنوی گھرانے کی خاتون کے بطن سے خدا نے سات بہادر اور زبردست بیٹے عطا کئے جو اپنی ناموری میں کواکب سبعہ (سات ستارے) کہلاتے تھے اور یہ ساتوں کے سات مختلف مقامات اور ملکوں کے حاکم اور بادشاہ ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ خوش نصیب بہاالدین سام تھا جس کے دو فرزندوں' سلطان غیاث الدین اور سلطان شہاب الدین نے دولت غوریہ کی بنیاد رکھی اور حدود بنگال سے لے کر ارض عراق تک تمام علاقوں کے مالک اور حکمراں ہوئے۔

سلطان کا لقب سب سے پہلے سیف الدین غوری نے تخت غزنی پر بیٹھ کے اختیار کیا جو انہی کواکب سبعہ میں سے ہے۔ یہ اعزاز الدین حسین کا بیٹا تھا۔ بہاء الدین سام کا بھائی اور سلطان غیاث الدین اور شہاب الدین کے چچا۔

جس وقت اعزاز الدین حسین اس شکستہ پڑے پر شیر کے پہلو میں بیٹھا موجوں کے تھپیڑے کھا رہا تھا اور زندگی سے اس قدر مایوس تھا کہ نہ اسے اپنے ہم

پہلو شیر کا خوف تھا اور نہ شیر کو اس کی جان لینے کا خیال، اس وقت بھلا اس کے دل میں بھی یہ بات گزر سکتی تھی کہ عنقریب اس کی نسل میں سر پر آرائی اور جہاں بانی ہو گی یا جلاد نے جس وقت اس کی جان لینے کے لئے تلوار ہاتھ میں تولی تھی اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہو سکتی تھی کہ جس تاجدار کے حکم سے وہ قابل گردن زدنی قرار پایا تھا، اس کے پرچم اقبال کو اس قریب القتل شخص کی اولاد پامال کرے گی؟ ہرگز نہیں۔ لیکن خوب یاد رکھئے اور خیال رہے کہ ہمارے وہم و گمان میں ہو یا نہ ہو دنیا میں ایسے انقلابات بہت نظر آتے ہیں اور زمانہ کا یہی مشغلہ ہے ایسے واقعات گو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں مگر وہ اکثر پیش آتے ہیں اور یہی واقعات ہیں جو ہمیں انتہا سے زیادہ ناکامی کی حالت میں مایوس نہیں ہونے دیتے۔ سچ یہ ہے کہ بظاہر حالات کیسے ہی نظر آتے ہوں، مگر قسمت جب تک کوئی کام کر نہ گزرے ہم نہیں جان سکتے کہ کیا کرنے والی ہے۔

فتح ہند:

ہند کی منظم فتح کا سہرا سلطان معز الدین (محمد غوری) کے سر ہے۔ اس کا شمار بانیان سلطنت میں ہونا چاہئے۔ اس کی سیاسی بصیرت قابل داد ہے۔ اس نے ہند کی سیاسی اور عسکری کمزوری کو تاڑ لیا اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کا عزم و استقلال تھا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری

بلکہ نا کامی نے اس کی اپچ اور عزم کو اور بھی ابھارا۔ اس کی عسکری قیادت میں محمود غزنوی جیسی چمک نہ تھی جو اپنی تیزی ہی سے خیرہ چشم کر دیتی تھی۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا وہ اپنے عزم صمیم اور مسلسل سعی سے حاصل کیا۔ وہ بڑا مردم شناس تھا۔

اس نے ترک غلاموں کی ایک بڑی جماعت کو تربیت دے کر اپنی سلطنت کو وسعت کا کام ان کے سپرد کیا۔

پس شمالی ہند کی فتح اس کے غلام امرا کے ہاتھوں ہی تکمیل کو پہنچی۔ انہوں نے اس کار عظیم کو اس کی موت کے بعد بھی جاری رکھا۔ اس کے ترک امرا میں چار نام خصوصیت کے حامل ہیں:

نمبر 1 قطب الدین ایبک

نمبر 2 یلدوز

نمبر 3 قباچہ اور

نمبر 4 بختیار خلجی۔

ان امرا میں بختیار خلجی کے حیرت انگیز کارنامے قابل ذکر ہیں۔ اس لئے انہیں یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

بختیار خلجی

بختیار خلجی نے نہایت حقیر حیثیت سے عروج حاصل کیا۔ وہ ذاتی وجاہت سے بھی محروم تھا اس لئے غزنی اور دہلی میں اسے کسی نے ملازم رکھنا بھی پسند نہ کیا بالآخر بنارس اور اودھ کے کماندار نے اسے ایک معمولی درجہ کا افسر مقرر کیا اور دو

گاؤں بطور تنخواہ عطا کئے۔ انہی کی آمدنی سے خلجی سواروں کا ایک رسالہ تیار کر کے اس نے مگدھ (موجودہ صوبہ بہار) کے علاقہ پر یورش کی اور پیہم کامیاب حملوں سے اس نے اس علاقہ میں اپنی دھاک بٹھا دی۔ پھر اس کا حوصلہ بڑھا اور قطب الدین ایبک سے اجزات لے کر اس نے صرف دوسو سواروں سے "آوند پور دھار" پر قبضہ کر لیا۔

یہ واقعہ تیرھویں صدی کے ابتدائی سالوں کا ہے۔ بختیار خلجی کے اس کارنامہ سے اس کی شہرت کا چار چاند لگ گئے۔

یہاں سے پرے بنگال میں سینا خاندان کا راجہ لکشمی سینا حکمران تھا۔ بہار کی فتح سے بنگال کی سرحد غیر محفوظ ہو گئی تھی لیکن راجہ اور پرجا کسی نے اس طرف توجہ نہ دی۔ راجہ معمر تھا اور لوگوں میں بھی ہمت اور قومی جذبہ ناپید تھا۔ پھر بھی ساری ریاست پر بھرپور حملہ کرنا بختیار خلجی کی استطاعت سے باہر تھا۔ اس لئے اس نے راجدھانی ناویا پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔

بس وہ جنوبی بہار کے غیر آباد علاقہ میں سے ہوتا ہوا اس سرعت سے آگے بڑھا کہ وہ جب ناویا کے دروازے پر پہنچا تو اس کے ساتھ صرف اٹھارہ سوار تھے۔ ان اٹھارہ سواروں کو حملہ آور کون سمجھتا' اس لئے انہیں :۔

سمجھ کر قلعہ میں آنے دیا گیا۔ قلعہ میں داخل ہو کر ان اٹھارہ سواروں نے اک دم حملہ کر دیا۔ ترکون کے پیہم حملوں سے خوف و ہراس پہلے ہی پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ راجہ فوراً قلعہ چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

اس سے قلعہ والوں کی رہی سہی طاقت بھی ختم ہو گئی۔ اس دوران بختیار کی فوج کا باقی حصہ بھی آ پہنچا۔ پھر قلعہ اور شہر پر قبضہ ہو گیا۔ ناویا پر قبضہ کرنا آسان تھا مرکز شمالی بنگال میں لکھنوتی کے مقام پر بنایا جو بہار سے متصل ہونے کے باعث زیادہ محفوظ تھا۔

بختیار خلجی کا روز افزوں حوصلہ اسے نچلا نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ پس ناویا کے کارنامے کو ابھی دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ اس نے اور ایک زبردست حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس مرتبہ اس کی اولوالعزمی نے ایک اور بھی مشکل انتخاب کیا تھا۔ اس نے شمالی بنگال اور آسام کی راہ سے بھوٹان اور تبت پر حملہ کی ٹھانی۔

راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ کامروپ کے راجہ نے مشورہ دیا کہ مہم کو ایک سال کے لئے ملتوی کر دیا جائے لیکن بختیار خلجی اپنی دھن کا پکا تھا۔ وہ پہاڑی راستوں اور تیز روندیوں کو عبور کرتا ہوا آگے بڑھا مگر مقامی فوج سے ایک غیر فیصلہ کن لڑائی کے بعد اسے واپس لوٹنا پڑا۔

اس واپسی میں خوراک اور رسد حاصل نہ ہونے سے اسے سخت مصیبت اٹھانی پڑی۔ سب سے بڑی یہ مصیبت آئی کہ جس پل کو عبور کر کے وہ ندی پار گیا

تھا واپسی میں اس پل کو اس نے شکستہ پایا۔ ادھر سے کامروپ کی فوج نے حملہ کر دیا۔ بختیار خلجی نے کوئی راہ نہ پا کر دریا میں گھوڑا ڈال دیا۔ دریا کی دھار تیز تھی۔ اس کی ساری فوج پانی کی نذر ہو گئی،

بختیار خلجی صرف ایک سو سپاہیوں کے ساتھ دوسرے کنارے پہنچا۔ اس ناکامی نے اس کی کمر توڑ دی۔ وہ لکھنوتی بھی نہیں گیا بلکہ دیوکوٹ ہی میں رک گیا۔ وہ اپنی ناکامی پر اس قدر خجل تھا کہ محل کے باہر بھی نکلتا تھا۔ آخر دل شکستگی نے مرض الموت کی صورت اختیار کر لی اور وہ صاحب فراموش ہو گیا۔ اس حالت میں اس کے ایک نائب نے جس کا نام افسر علی تھا' اپنا خنجر لے اس کا کام تمام کر دیا۔

قارئین کرام:۔

آپ کا یہ خادم یعنی زیب ملیح آباد روز صبح قلم چلانے سے پہلے اپنی تازہ ڈاک کے خطوط کا مطالعہ کرتا ہے ان خطوط میں عام طور پر میری تحریروں کی تعریف ہوتی ہے مگر بعض خطوط ایسے ہوتے ہیں جنہیں پڑھ کے افسوس بھی ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں تاریخی افسانہ نگار اور ناول نگار ہوں اور اپنی کتابوں (افسانوں اور ناولوں) میں ایسی کوئی بات نہیں لکھتا جو اسلامی تاریخ کے خلاف ہو اور جس کا تاریخ میں حوالہ نہ ملتا ہو۔

آج کی ڈاک میں ایک ایسا ہی خطوط موصول ہوا ہے جس میں اس بات کا شکوہ کیا گیا ہے کہ میرے ناولوں میں عوام کی دلچسپی کے لئے میں تاریخی واقعات کو افسانہ میں ڈھال کر پیش کرتا ہوں جو ایک ''شدید تاریخی غلطی'' ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں اسلامی تہذیب و تمدن میں ''افسانہ یا رومان'' کو کوئی دخل نہیں۔

کیونکہ اسلام کی ہر بات سچی اور صحیح ہوتی ہے جبکہ میرے ناولوں میں ہر ناول میں کوئی نہ کوئی ''تاریخی رومان'' ضرور ہوتا ہے اس لئے انہیں میری تحریروں سے اختلاف ہے۔

اس سلسلے میں میں صرف یہ عرض کروں گا کہ یہ درست ہے کہ میرے ہر ''ناول'' میں کوئی عشقیہ داستان ضرور ہوتی ہے لیکن یہ داستان یا رومان غیر تاریخی یا فرضی نہیں ہوتا ہے بلکہ میں اسے اسلامی تاریخ یا اسلامی کتابوں سے ''اخذ'' کر کے اسے عشق و محبت میں پرو کر رومان کی شکل دیتا ہوں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ خلافت راشدہ (حضرت ابو بکرؓ سے حضرت عثمان غنیؓ) کے زمانہ میں کوئی رومان نہیں ہوا مگر میں (یعنی راقم الحروف) نے اس دور میں بھی جھوٹا سچا افسانہ تراش کے اسے حقیقت کا روپ دینے کی کوشش نہیں کی۔

میں اپنے معترض کے اس اعتراض کے جواب میں اپنی اس کتاب میں ایک ایسا رومان پیش کر رہا ہوں جو خلافت راشدہ کے پہلے اور دوسرے خلیفہ کے دور حکومت میں پیش آیا۔

اس سلسلے میں میں اس رومان کے آغاز میں اس کے بارے میں صرف دو تین جملوں کا اضافہ کروں گا۔

میرے اس رومان کا نام ہے:۔

''بنت عتبہ''

خلیفہ اول اور خلیفہ دوم کے دور خلافت میں جنگ یرموک اور جنگ وذشق کے ایک جانباز ابان بن سعید بن عاص اور اس کی نو بیاہتا بیوی ''بنت عتبہ'' کی ایمان افروز اور ولولہ انگیز داستان محبت وشجاعت پیش کر رہا ہوں۔

بنت عتبہ

جہاد کا زمانہ سن ہجرہ کا تیرھواں سال عتبہ کی تیانداز بیٹی کا سن بھی تیرہ سال ہی کا تھا۔ اٹھتی جوانی، ارمانوں اور آرزوؤں سے بھرا دل لیکن وہ سپاہی زادی تھی، جوانی کی تمام امنگوں کے ساتھ بنت عتبہ کی سب سے بڑی تمنا ''جہاد تھی۔

وہ چاہتی میدان جنگ ہو سامنے کفار کا لشکر اور اس کے ہاتھ میں تیر اندازی کا شوق اسے جنون کی حد تک تھا۔

ایک دن باپ سے بولی:

''بابا! مدینہ میں جہاد کی دولت لٹ رہی ہے۔ ہماری جھولی کیوں خالی ہے۔ خلیفہ محترم سے اجازت کیوں نہیں حاصل کرتے؟''

عتبہ نے شفقت سے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''بیٹی! کیا تم مجھے غافل سمجھتی ہو؟ لیکن یہ نعمت شاید ہماری قسمت میں

نہیں''۔

''کیوں نہیں ؟'' بنت عتبہ ٹھنک کے بولی۔ ''کیا آپ ایک بہترین شمشیر زن نہیں۔اور میں۔میرا تیر تو اپنے نشانہ کو خود ڈھونڈ لیتا ہے۔''

''اچھا اتنا گھمنڈ ہے اپنی تیر اندازی پر۔'' عتبہ ہنسے۔ ''موقع ملا تو ضرور تمہارے جوہر دیکھیں گے۔''

''بابا یہی تو بہترین موقعہ ہے۔جنگ ختم ہو گئی تو ہم کیا کریں گے؟''

عتبہ سنجیدہ ہو گئے اور بولے:

''بیٹی !میں نے خلیفہ محترم سے درخواست کی تھی لیکن انہوں نے اجازت نہیں دی۔انہوں نے جواب دیا تھا کہ پہلے بیٹی کے فرض سے فارغ ہو جاؤ پھر جہاد پر جانا۔''

یہ سن کر بنت عتبہ نے حیا سے گردن جھکالی پھر کچھ سوچنے کے بعد بولی:

''بابا! دوسری عورتیں بھی تو آخر جہاد پر گئی ہیں۔آپ خلیفہ سے درخواست کریں کہ میری بیٹی ''جہاد'' کو شادی پر ترجیح دیتی ہے۔پھر وہ ضرور مان جائیں گے۔''

اور عتبہ صرف ''ہوں'' کہہ کر خاموش ہو گئے۔ جواب دیتے بھی تو کیا دیتے۔مسلمان لڑکی کا ٹھکانہ ماں کا سایہ یا پھر سسرال کی چوکھٹ۔عتبہ کی شریک حیات بچی کو چار سال کا چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔عتبہ اس وقت صرف تیس پینتیس سال کے تھے۔چاہتے تو دوسری شادی کر سکتے تھے لیکن بچی کی معصومیت ان کے پیر کی بیڑی بن گئی اور وہ اپنا عیش و آرام چھوڑ کر بیٹی کی پرورش میں لگ

گئے۔

بیٹی نے باپ کے دل میں شہادت کی آرزو اور جہاد کے شوق کی ایسی جوت جگائی کہ وہ ہر دم بے چین رہنے لگے۔ میدان جنگ سے کوئی قاصد آتا تو اس کے پیچھے لگ جاتے۔ اپنے گھر بلا کے اس سے لڑائی کے حالات سنتے پھر سوچتے کہ وہ گھڑی کتنی مبارک ہو گی جب وہ مجاہدوں کے دوش بدوش جہاد میں حصہ لیں گے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بیٹی کے لئے کسی مناسب لڑکے کی تلاش میں بھی رہتے لیکن اس وقت مدینہ منورہ تو جیسے جوانوں سے خالی ہو گیا تھا۔ قریب قریب سب ہی جوان جوش جہاد سے سرشار ہو کر مختلف محاذوں کا رخ کر چکے تھے اور جو باقی تھے وہ اپنی باری کے منتظر تھے۔

عتبہ نے کئی مرتبہ ایسے نوجوانون سے بالواسطہ گفتگو کے ذریعہ ان کا عندیہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ یہ نہیں کہ بنت عتبہ میں کوئی عیب تھا یا وہ خوبصورت نہ تھی بلکہ وہ تو ہزار دو ہزار میں بیٹی نہ تھی۔ عتبہ جس محفل میں جاتی، محفل چمک اٹھتی۔ دوشیزائیں اسے گھیر لیتیں اور اس کی دوستی پر فخر کرتیں۔ مدینہ کے جوان بھی بنت عتبہ کے ساتھ شادی کے لئے تیار تھے لیکن جہاد کے اختتام پر۔

عتبہ کو جب مدینہ میں کامیابی نہ ہوئی اور ان کی دوڑ دھوپ کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو انہوں نے طائف جانے کا ارادہ کیا۔ طائف میں ان کے بھائی رہتے تھے۔ وہ ضعیف العمر تھے۔ جہاد میں حصہ نہ لے سکتے تھے۔ خلیفتہ المسلمین حضرت ابو بکر نے انہیں جوانوں کی تربیت کا کام سپرد کیا تھا۔ طائف میں ایک چھوٹی فوجی چھاؤنی تھی۔ محاذ پر جانے والے مجاہدین کو وہاں سے اسلحہ دیا جاتا تھا اور نو جوانوں

کو کچھ دن فوجی تربیت دی جاتی تھی۔ عتبہ نے دراصل طائف جانے کا اس لئے فیصلہ کیا تھا کہ ممکن ہے کہ وہاں کوئی معقول رشتہ مل جائے اور بیٹی کو بیاہ کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔

بنت عتبہ کو باپ کی فکرو پریشانی کا پورا احساس تھا۔ وہ جانتی تھی کہ عتبہ محاذ جنگ پر جانے اور جہاد میں حصہ لینے کے لئے بے چین تھے لیکن اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ باپ کی پریشانی کس طرح دور کرے۔ ایک دن عتبہ باہر سے آئے تو کچھ زیادہ پریشان تھے۔ چنانچہ بنت عتبہ نے گھبرا کے پوچھا:

''بابا خدا خیر کرے۔ آج آپ بہت پریشان ہیں۔''

''ہاں بیٹی۔'' اور عتبہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''سنا ہے کہ ملک شام کے محاذ پر کمک بھیجی جارہی ہے۔''

''پر آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ خلیفہ سے ملنے جائیے'' بنت عتبہ نے ادب سے کہا۔

''بیٹی میرا ارادہ ہے.........'' اور عتبہ کہتے کہتے رک گئے۔

بنت عتبہ نے چند لمحے انتظار کیا جب باپ نہ بولے تو بنت عتبہ نے کہا۔

''بابا میں جانتی ہوں۔ میں آپ کے راستے کا پتھر بن گئی ہوں مگر آپ مجھے جو حکم دیں گے میں اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔''

عتبہ محبت سے بولے:

''بیٹی تم میری آنکھوں کا نور ہو۔ تمہاری فکر ضرور ہے لیکن پریشانی نہیں ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے اگر تم بھی اسے پسند کرو۔''

بنت عتبہ نے باپ کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور بڑے ادب سے بولی:

''بابا جس بات سے آپ کے دل کو تسکین ہو اس پر عمل کرنا میرا فرض ہے۔ مجھے آپ صرف حکم دیجئے۔''

''میں طائف جانا چاہتا ہوں بیٹی۔''

''تو پھر اس میں فکر کی کیا بات ہے؟''

''تم بھی میرے ساتھ چلو گی۔''

بنت عتبہ خوش ہو گئی۔ طائف کے فوجی کیمپ کی اس نے بڑی شہرت سنی تھی۔ اپنے تایا اور تائی سے بھی وہ بہت دنوں سے نہ ملی تھی۔ اس نے سوچا طائف جانا ایک پنتھ دو کاج ہوگا۔ عزیزوں سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور طائف کی چھاؤنی کی سیر بھی۔

پس وہ لپک کے بولی:

''بابا! یہ تو اور بھی اچھا ہو گا۔ میں تایا تائی سے بہت دنوں سے ملنا چاہتی تھی۔''

باپ کی فکر قدرے کم ہوئی۔ وہ بولے:

تو بس تم ابھی تیار ہو جاؤ۔

عتبہ تو یہ کہہ کر باہر چلے گئے اور بنت عتبہ نے فوراً تیاری شروع کر دی۔

چوتھے دن شام کو باپ بیٹی طائف پہنچ گئے۔

عتبہ کے بھائی اور بھاوج کو ان کے آنے کی بڑی خوشی ہوئی بنت عتبہ کو سب سے زیادہ خوشی تھی۔ تایا کا گھر فوجی چھاؤنی کے ایک کونے پر تھا۔ شام ہونے کی

وجہ سے وہ تربیت گاہ کا کوئی منظر نہ دیکھ سکی لیکن میدان کے چاروں طرف لگے خیموں سے اس نے اندازہ لگایا کہ اس میں خوش نصیب مجاہدین رہتے ہیں۔اس نے فیصلہ کیا کہ صبح ہوتے ہی وہ میدان کی سیر کو جائے گی اور مجاہدین کو تربیت حاصل کرتے دیکھے گی۔

مہمانوں کے آنے کی وجہ سے گھر میں چہل پہل ہوگئی۔تایا کے اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔عتبہ کی بیٹی کو وہ اپنی ہی بیٹی سمجھتے تھے۔رات دیر تک سب جاگتے رہے۔عتبہ بڑے بھائی سے میدان جنگ کی خبریں سنتے رہے اور بنت عتبہ تائی کو مدینہ کے حالات بتاتی رہی۔طائف مدینہ سے زیادہ دور نہ تھا لیکن ان کی آپس میں برسوں ملاقات نہ ہوتی۔تائی کرید کرید کر اپنی پرانی جاننے والیوں کا حال سنتی رہی اور بنت عتبہ ہنس ہنس کے ہر ایک تفصیل بتاتی رہی۔تین کمروں کے اس مکان میں اتنی جگہ کہاں تھی کہ کوئی راز کی بات کی جاسکتی۔ایک کمرے میں اسلحہ خانہ ٹوٹی پھوٹی تلواروں نیزوں اور تیر کمانوں سے بھرا تھا۔اس کے برابر کے دو نوں کمرے رہائش کے لئے استعمال ہوتے تھے۔عتبہ بھائی کے ساتھ ایک کمرے میں تھے۔انہیں دوسرے کمرے سے چچی بھتیجی کی باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔عتبہ بھائی سے بیٹی کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتے تھے لیکن ڈر تھا کہ کہیں بھاوج یا بیٹی نہ سن لیں۔پس عتبہ مجبوراً ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔بیٹے کا ذکر کرنے کا انہیں موقعہ ہی نہ ملا۔اس طرح ان کے بڑے بھائی باتیں کرتے کرتے ہی سو گئے۔

صبح کو بھی عتبہ کو بھائی سے گفتگو کا موقعہ نہ مل رہا تھا۔ بھائی کو میدان میں

جانے کی جلدی تھی۔ بنت عتبہ نے رات ہی کو اس بات پر آمادہ کرلیا تھا کہ وہ تایا کے ساتھ مجاہدوں کی تربیت دیکھنے جائے گی۔ پس وہ تیار ہو کر تایا کے پاس پہنچ گئی۔اب عتبہ بات کرتے تو کیسے۔بیٹی ان کے سر پر سوار تھی۔

آخر عتبہ کو کہنا پڑا:

''بیٹی تم تائی کے پاس جا کر بیٹھو مجھے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

بنت عتبہ کا چہرہ اتر گیا۔ وہ تو میدان میں جانے کی خوشی میں پھولے نہ سما رہی تھی۔

تایا نے اسے پریشان دیکھا تو بولے۔

''تم کیوں پریشان ہو گئیں بیٹی۔عتبہ بہت دن بعد آئے ہیں۔ہم رات زیادہ دیر تک باتیں نہ کر سکے۔ذرا دیر اور انتظار کرلو۔بس ابھی چلتے ہیں''۔

بنت عتبہ نے کوئی جواب نہ دیا۔وہ یونہی کھڑی رہی۔

اس وقت تائی نے دخل دیا:

''بیچاری کو فوجی تربیت دیکھنے کا شوق ہے اور آپ اسے خواہ مخواہ جھڑک رہے ہیں۔''

تایا کو خیال آ گیا کہ وہ بنت عتبہ کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔وہ تیر کمان لٹکا کر آئی تھی اور اب اسے روک دیا گیا ہے۔

آخر انہوں نے کہا:

''اچھا۔ دل چھوٹا نہ کرو۔تم میدان میں چلو۔ میں ابھی بات کر کے آتا ہوں۔''

بنت عتبہ خوش ہوگئی۔ وہ تائی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

تائی بولیں:

"جاؤ بیٹی۔ ڈر کا ہے کا۔ ماشاءاللہ تم بھی تیرانداز ہو۔"

بنت عتبہ نے ہاتھ بڑھا کر تایا کی کمر میں لگی تلوار کھینچ لی اور ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

جوانی بذات خود ایک "حسن" ہے اگر اس میں حسن خداداد بھی شامل ہو جائے تو پھر اس کا کیا کہنا۔ بنت عتبہ کو خدا نے حسین دل اور حسین شکل وصورت سے نوازا تھا۔ جب وہ میدان میں تلوار لہراتی اور کاندھے پر ترکش وکمان لٹکائے نکلی تو ایک قیامت سی برپا ہوگئی۔ عرب جوان جگہ جگہ ٹولیاں بنائے اسلحہ صاف کر رہے تھے۔ کوئی تیر کی نوک درست کر رہا تھا تو کوئی نیزے کو سان دے رہا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں تلوار تھی تو کوئی خنجر کی دھار پر انگلی پھیر رہا تھا۔

انہوں نے ایک حور ارضی کو اس شان سے آتے دیکھا تو جو جس حال میں تھا اس حال میں دم بخود ہو کر رہ گیا اور تمام نظریں ایک اس پیکر پر جم کے رہ گئیں۔

بنت عتبہ سب سے بے پرواہ ی شان بے نیازی سے ان کے درمیان سے گزرتی رہی۔ ایک جگہ چار چھ جوان تلواروں کو صیقل کر رہے تھے۔ بنت عتبہ ان کے قریب سے گزری تو ایک نے دوسرے کو ٹہوکا دیتے ہوئے کہا:

"دیکھ رہا ہے ابان؟"

ابان نے آہستہ سے جواب دیا۔

"جب عورت کے ہاتھ میں تلوار آجائے تو مردوں کو چوڑیاں پہن کے گھر

میں بیٹھ جانا چاہیے۔''

ابان نے بہت آہستہ سے جواب دیا تھا لیکن یہ بات بنت عتبہ کے کانوں تک پہنچ گئی۔وہ چند قدم ان سے آگے نکل چکی تھی۔یہ بات سن کر بنت عتبہ رکی اور پلٹ کر تیزی سے ان کے پاس آ گئی۔عرب جوانوں کے چہرے فق ہو گئے۔ابان تو ایسا گھبرایا کہ صیقل کرنے والا پتھر اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

بنت عتبہ نے ابان کے پاس پہنچ کر سخت لہجے میں سوال کیا:

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''ابان''ابان نے گھٹی آواز میں جواب دیا۔

''ابان! کیا کہا تھا تم نے؟''بنت عتبہ کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔

''جی۔جی میں نے......''ابان نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔''مین نے آپ سے تو کچھ نہیں کہا۔''

بنت عتبہ ابان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی:

''تم بزدل ہو ابان۔ایک عورت کے سامنے اس قدر گھبرا رہے ہو تو میدان میں جا کے کیا کرو گے؟''

ابان کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی غیرت کو للکار دیا ہو۔وہ اکڑ کے بولا:

''ہاں۔کہا تھا اور ٹھیک کہا اور ٹھیک کہا تھا۔عورت کے ہاتھ میں تلوار نہیں چوڑیاں اچھی لگتی ہیں۔''

بنت عتبہ کو ایسے جواب کی امید نہ تھی۔وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔کہاں

تو ابان کے منہ سے گھبراہٹ کے مارے آواز نکلی تھی اور اب وہ اکڑ رہا ہے۔ پس وہ نرم پڑ گئی۔

وہ بولی:

''ابان! عورتیں گھر میں چوڑیاں پہنتی ہیں لیکن جب میدان جنگ میں آتی ہیں تو ان کے کاندھے پر ترکش اور ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے۔''

اٹھارہ سالہ نوجوان ابان للکارنے پر سامنے تو آ گیا لیکن بنت عتبہ کی حاضر جوابی نے اسے بڑا متاثر کیا پھر بھی دوستوں کے سامنے اپنا وقار برقرار رکھنے کے لئے بولا:

''تلوار ان ہاتھوں میں اچھی لگتی ہے جو اس کا استعمال جانتے ہوں۔''

بنت عتبہ تلوار چلانے میں ماہر نہ تھی۔ اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔ پھر یہ ڈر تھا کہ اگر اس نے تلوار چلانے کا غلط دعویٰ کیا اور ابان نے اسے کہیں مقابلے کی دعوت دیدی تو پھر وہ کیا کرے گی۔

کچھ سوچنے کے بعد بنت عتبہ نے کہا:

''میں تلوار چلانے کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں تیر انداز ہوں۔''

''تیر انداز۔'' ابان نے محسوس کیا کہ اس کے سامنے کھڑی دوشیزہ کچھ دب کر بول رہی ہے۔ اس سے اس نے فائدہ اٹھایا اور بڑھ چڑھ کے بولا:

''آپ کو تیر چلانے کی کیا ضرورت؟'' اور وہ مسکرانے لگا۔

بنت عتبہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ کڑک کے بولی:

میں نہیں جانتی تھی کہ طائف کے جوان اتنے نامعقول ہوتے ہیں کہ وہ

خواتین کی عزت کرنا بھی نہیں جانتے۔

''کیا میں یہ دریافت کرسکتا ہوں کہ آپ کا تعلق عرب کے کس علاقے سے ہے؟''

''یثرب۔مدینۃ النبیؐ'' بنت عتبہ نے فخر سے سر اونچا کرتے ہوئے کہا۔

''یثرب۔'' اورابان نے حیرت سے بنت عتبہ کو دیکھا پھر عاجزی سے بولا۔

''اوہ قابل احترام خاتون! میں معافی کا خواستگار ہوں۔مدینہ کی تو خاک بھی ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے۔میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں۔''

ابان نے کچھ اس طرح عاجزی کا اظہار کیا کہ بنت عتبہ کو اپنے سخت لہجے پر افسوس ہونے لگا۔وہ نرمی سے بولی:

''آپ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میں اپنے تلخ لہجے پر نادم ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے بنت عتبہ نے ایک دزدیدہ نظر ابان پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔ابان اس کی مترنم آواز کے کیف میں ڈوبا ہوا تھا کہ بنت عتبہ جانے لگی تو اس نے چونک کے کہا:

''کیا میں قابل احترام مدنی خاتون کا نام پوچھنے کی گستاخی کرسکتا ہوں۔''

بنت عتبہ کے رخسار حیا سے گل رنگ ہو گئے۔وہ نظریں جھکائے ہوئے بولی۔

''نام ثمن ہے مگر بنت عتبہ کے نام سے پکاری جاتی ہوں۔''

بنت عتبہ ایک لمحہ جواب کا انتظار کرتی رہی۔پتہ نہیں اسے کس طرح کے

جواب کا انتظار تھا۔ ابان نے سوال کیا۔ اس نے جواب دیدیا۔ اب کس بات کا انتظار تھا۔ ابان اس کے نام کی حلاوت میں کھویا ہوا تھا۔ ثمن بنت عتبہ۔ عتبہ کی بیٹی۔ یہ عتبہ کون ہیں؟ مدینہ کے کوئی رئیس معلوم ہوتے ہیں۔

ابان نے کچھ نہ پوچھا نہ بنت عتبہ نے کوئی جواب دیا۔ پھر بھی ایک بار دو جھجکتی نظریں اٹھ کر آپس میں ٹکرائیں۔ بنت عتبہ ان نظروں کی تاب نہ لاسکی اور نقاب درست کرتی آگے بڑھ گئی۔ باتوں کے دوران اس کے چہرے کا نصف جالی دار نقاب سرک گیا تھا۔ اسے خیال گذرا کہ کہیں ابان نے اس کا پورا چہرہ نہ دیکھ لیا ہو۔

''ہوں'' دیکھ لیا ہوگا تو کیا ہے۔ میں ایسی بری تو نہیں کہ لوگ انگلیاں اٹھائیں۔'' بنت عتبہ اپنے دل کو سمجھاتی اور تسلیاں دیتی بڑے بڑے قدم اٹھانے لگی۔ ایک طرف نیزے بازی کی مشق ہو رہی تھی دوسری جانب نیزے بازی کا مقابلہ جاری تھا۔ بنت عتبہ نے ادھر ہی کا رخ کیا۔

بنت عتبہ کے جانے کے بعد ابان عجیب عجیب خیالوں میں کھو گیا۔ اس کے دوست بڑی دلچسپی سے دونوں کی نوک جھونک سن رہے تھے۔ جب ثمن چلی گئی تو انہوں نے ابان کو چونکایا۔

ایک نے کہا:

''ابان۔ بڑی حاضر جواب لڑکی ہے۔ تمہارا منہ پھیر کے رکھ دیا۔''

دوسرے نے ٹکڑا لگایا:

''ابان بیچارہ تو بس بغلیں جھانک کے رہ گیا۔''

تیسے نے ابان کی حمایت کی۔

''ابان نے بڑا ڈٹ کے مقابلہ کیا۔ ہماری تو آواز بھی نہ نکل سکی۔''

''میں کہتا ہوں اسے تیر کمان کی ضرورت ہی نہیں'' ایک منچلے نے تبصرہ کیا۔

''وہ جدھر نظر بھر کے دیکھ لے بس کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں۔''

''نہیں دوست'' ابان ناگواری سے بولا۔ ''شریف لڑکیوں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرتے۔ تم نے غور نہیں کیا کہ وہ کس قدر بے خوفی سے گفتگو کر رہی تھی۔ شریف لڑکیوں کی سب سے بڑی یہی پہچان ہے۔''

پھر سب گھبرا کے اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ انہوں نے چھاؤنی کے ناظم کو اپنی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ ناظم اپنے چھوٹے بھائی عتبہ کو لئے میدان میں داخل ہوئے عتبہ نے اپنی پریشانی سے بھائی کو آگاہ کر دیا تھا۔ شاید اس لئے وہ زیادہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔ ناظم جس طرف سے گزرتے 'زیر تربیت جوان انہیں سلام کرتے اور خوش آمدید کہتے۔ ناظم ہر جوان کو جواب دیتے اور اس کے چہرے کو اس طرح دیکھتے جیسے اس کے چہرے پر کوئی لکھی ہوئی تحریر پڑھ رہے ہوں۔

ناظم صاحب چلتے چلتے ابان کے پاس آ کر رک گئے۔ ابان نے انہیں ادب سے سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا اور پھر ابان کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ ابان گھبرا گیا۔ معاً اسے گمان ہوا کہ کہیں بنت عتبہ نے اس کی شکایت تو نہیں کر دی' ابان! ابھی اس گمان پر غور ہی کر رہا تھا کہ اس کے کان میں آواز آئی۔

''ابان! میرے ساتھ آؤ''۔

ابان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور اس کا گمان یقین میں بدل گیا۔

ضرور بنت عتبہ نے شکایت کی ہے جبھی تو ناظم صاحب اسے اپنے ساتھ بلا رہے ہیں۔ ابان کا خوف کے مارے خون خشک ہونے لگا۔ اسے بنت عتبہ پر سخت غصہ آرہا تھا۔ بات تو خود اس نے شروع کی تھی۔ میں نے کیا کہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مدینہ کا کہتی ہے مگر عادت کیا بری پائی ہے۔ میں نے تو معافی بھی مانگ لی تھی پھر بھی چکایت کر دی۔ دل کی اچھی نہیں۔ صرف صورت سے کیا ہوتا ہے۔ لڑکی کی صورت نہیں سیرت دیکھی جاتی ہے۔ میں صاف کہہ دوں گا کہ بات اسی نے شروع کی تھی۔

ابان یہ سب کچھ سوچتا اور ناظم صاحب کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ نیزے بازی کے میدان میں پہنچ کے ناظم رک گئے۔ اور عتبہ سے بولے۔

"یہ ابان ہے۔ بہت نیک اور شریف جوان۔ ان کے باپ بھی میری شاگرد رہ چکے ہیں"

عتبہ نے دلچسپی سے ابان کو دیکھا۔ ابان نے ادب سے عتبہ کو سلام کیا۔ ناظم کی تعریف سے اس کا دل بہت مطمئن ہوا تھا۔ اب ناظم صاحب نے عتبہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

"بیٹے ابان! یہ ہیں چھوٹے بھائی عتبہ۔ انہیں جہاد کا بہت شوق ہے لیکن ابھی تک اجازت نہیں ملی۔"

عتبہ کے نام پر ابان کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے ادب سے پوچھا:

"یہ محترم مدینۃ النبیؐ سے تو تشریف نہیں لائے؟"

"ہاں بیٹے! یہ مدینہ سے آئے ہیں۔" ناظم پیار سے بولے۔ "مگر تمہیں

کیسے معلوم ہوا۔ تم پہلے مل چکے ہو کیا؟''

''نہیں نہیں''۔ ابان گھبرا گیا۔ ''میں نے صرف اندازہ لگایا تھا''۔

اندازہ کیا۔ ابان کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ بزرگ وہی ہیں جن کی صاحبزادی سے ابھی اس کی چونچیں ہو چکی ہیں۔ ناظم صاحب نے اس کے خیال کی تصدیق کر دی۔

انہوں نے کہا:

''عتبہ اپنی بیٹی کے ساتھ آئے ہیں۔ دونوں کے دل شوق جہاد سے لبریز ہیں۔'' ناظم نے بتایا۔

ابان کے دل میں اگر شبہ کا کوئی شائبہ تھا تو وہ ناظم کی اس وضاحت سے بالکل دور ہو گیا۔

اب ناظم صاحب عتبہ اور ابان کے لئے ہوئے اس طرف چلے جہاں تیر اندازی کی مشق ہو رہی تھی۔ ابان کی نظروں نے دور ہی سے بنت عتبہ کو اس مجمع میں تلاش کر لیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑ کنے لگا۔ یہ لوگ قریب پہنچے تو انہیں دیکھ کر بنت عتبہ بھاگتی ہوئی ان کے پاس آئی۔ اس کے ہاتھ میں کمان تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

بنت عتبہ نے قریب پہنچتے ہی کہا:

''تایا جان۔ میں نے چار تیر چلائے اور چاروں ہی ٹھیک نشانے پر لگے۔''

اسی وقت اس کی نظر ابان پر پڑی اور وہ گھبرا گئی۔ حیا کا پسینہ اس کے رخساروں پر پھوٹ پڑا۔

ناظم صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا:

''کیوں نہیں۔ ہماری بیٹی بہترین تیر انداز ہے۔ یہ ضرور نام پیدا کرے گی اس فن میں۔''

پھر وہ ابان کی طرف دیکھ کے بولے:

''بیٹی۔ یہ ہے ابان۔ جس طرح تم تیراندازی میں ماہر ہو اسی طرح شمشیر زنی میں اس کا جواب نہیں۔ خدا نے اسے حوصلہ اور شجاعت بھی ایسی ہی دی ہے۔''

بنت عتبہ نے کنکھیوں سے ابان کو دیکھا۔ ابان کی نظریں ادھر ہی تھیں۔ نظروں کا یہ دوسرا ٹکراؤ تھا۔

ابان نے حوصلہ کیا۔ بولا:

''میں بنت عتبہ سے مل چکا ہوں''

''کہاں؟'' ناظم صاحب گھبرا گئے۔ انہوں نے مشکوک نظروں سے بنت عتبہ کو بھی دیکھا۔

بنت عتبہ کیوں کاموش رہتی۔ اس نے بھی اس حوصلے کا اظہار کیا۔

''جی ہاں تایا جان! میں میدان میں آئی تو سب سے پہلے ان ہی کا سامنا ہوا۔ تلوار کی دھار پر کھڑے تھے یہ''

''اچھا اچھا۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔'' ناظم صاحب شاید یہی چاہتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مسکرا کے عتبہ کی طرف دیکھا۔

''تایا جان آیئے۔ میں اپنا نشانہ دکھاتی ہوں۔'' بنت عتبہ نے ناظم صاحب کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

''میرے لئے کیا حکم ہے۔ میں یہیں ٹھہروں۔'' ابان نے شوخ نظروں سے بنت عتبہ کو دیکھتے ہوئے طنز یہ انداز میں کہا۔ ناظم نے بنت عتبہ کو اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ ابان کو بھی دعوت دو۔

بنت عتبہ آہستہ بولی:

تیر اندازی سے دلچسپی ہو تو انہیں بھی بلا لیجئے۔

ابان کا دل چاہا کہ وہ کہے کہ تیر اندازی سے زیادہ تیر کھانے کا حوصلہ ہے مگر وہ چپ چاپ ان کے ساتھ چلنے لگا۔

نشانہ گاہ میں لکڑی کے ایک موٹے ستون پر ''نشان'' بنا ہوا تھا۔ ایک بڑا دائرہ۔ اس کے اندر بتدریج چھوٹے دائرے اور سب کے بیچ میں ایک نقطہ۔ اصل نشانہ یہی نقطہ تھا۔ تیر اندزوں کی مشق جاری تھی اور نشانہ ان کی زد پر تھا۔

ناظم نے بس یونہی بات شروع کی۔ انہوں نے ابان سے پوچھا:

''اچھا ابان! یہ تو بتاؤ۔ سب سے مشکل نشانہ کس چیز کا ہوتا ہے؟''

ابان نے ایک لمحہ ذہن پر زور دیا پھر بولا:

''بزرگ محترم! ستون پر بنا ہوا نشان اپنی جگہ جامد ہے۔ اس میں کوئی حرکت نہیں۔ اسے نشانہ بنانا میرے خیال میں زیادہ مشکل نہیں۔''

بنت عتبہ کو جیسے غصہ آ گیا۔ اسے گمان ہوا کہ ابان نے جان بوجھ کر اس کا مذاق اڑایا ہے۔

وہ چڑ کے بولی:

''تایا جان! میرے خیال میں یہ جواب درست نہیں۔ اگر اس ننھے نقطہ پر

نشانہ لگانا آسان ہے تو پھر مشکل نشانہ کون سا ہوتا ہے؟''

''تم اپنے سوال کا خود ہی جواب دو بیٹی۔'' ناظم صاحب ہنستے ہوئے بولے۔

بنت عتبہ پریشان ہوگئی۔ اس نے تو اپنے خیال میں ابان کے اعتراض کا منہ توڑ جواب دیا تھا مگر وہ اب اپنے جواب میں خود ہی الجھ کے رہ گئی تھی۔ پھر بھی قدرے تامل کے بعد اس نے کہا:

''تایا جان۔ میرے خیال میں اڑتی چڑیا کی آنکھ کا نشانہ باندھنا سب سے زیادہ مشکل ہے''۔

''یہ جواب نامکمل ہے بزرگ محترم''۔ ابان نے خواہ مخواہ اعتراض جڑ دیا۔

اب تو بنت عتبہ کا غصے کے مارے برا حال ہوگیا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے ابان کو دیکھا۔ ابان کو ان نظروں پر بڑا پیار آیا۔

ناظم صاحب نے ابان سے سوال کیا:

''بنت عتبہ کا جواب نامکمل ہے تو تم اسے مکمل کر دو۔''

ابان نے فوراً اندازہ لگالیا کہ اب یہ چھیڑ چھاڑ مہلک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ پس اس نے مسکین صورت بنا کر کہا:

''محترم ناظم صاحب! میدان جنگ میں جب فوجیں آپس میں دست و گریباں ہوں اس وقت دشمن کی آنکھ کا نشانہ بنانا واقعی مشکل ترین کام ہے۔ میرا خیال ہے کہ بنت عتبہ یہی کہنا چاہتی تھیں۔''

''جی ہاں تایا جان میرا یہی مطلب تھا۔'' وہ جلدی سے بول پڑی۔

ابان کی باتوں سے اس کے تن بدن میں جو آگ سی لگ گئی تھی وہ اک دم ٹھنڈی پڑ گئی۔ اس نے ابان کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ سمجھوتہ کرنا چاہتی ہو۔

ادھر عتبہ اور ناظم صاحب کو ابان کی ذہانت کی داد دینا پڑی۔ عتبہ نے سوچا یہ نوجوان ایک دن شجاعت اور بہادری کی دنیا میں نام پیدا کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کہا۔

''ماشاء اللہ۔ لشکر اسلام میں جب تک ابان جیسے زیرک جوان موجود ہیں' ہمارا جھنڈا ہر میدان میں بلند رہے گا۔''

اور ابان کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ اس نے چور نظروں سے بنت عتبہ کو دیکھا۔

بنت عتبہ آسمان پر اڑتے چند پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ پرندے اس کی بائیں جانب سے آ رہے تھے۔ جب پرندے اڑتے ہوئے بنت عتبہ کی بائیں جانب سے گزر کر دائیں طرف پہنچے تو اس نے جلدی سے کاندھے سے کمان اتاری پھر ایک تیر اس میں جوڑا اور کمان کھینچتے ہوئے تایا سے کہا:

''تایا جان دیکھئے تیسرا پرندہ۔''

اور سب کی نظریں اوپر آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ پرندے آگے پیچھے تیزی سے اڑتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ان کی بلندی بھی کافی تھی۔ سب کی نظریں اوپر تھیں کہ ''زوں'' کی آواز کے ساتھ ایک تیر بنت عتبہ کی کمان سے نکلا اور دوسرے ہی لمحے تیسرا پرندہ تیر میں پیوست ہو کر نیچے گرتا ہوا دکھائی دیا۔

''سبحان اللہ۔'' ناظم صاحب کی زبان سے بیساختہ نکل گیا۔

انہوں نے آگے بڑھ کے بنت عتبہ کو بڑی محبت سے اپنے سینے سے لگا لیا۔

اس وقت ابان کا بھی جی چاہا کہ وہ بنت عتبہ کی اس بے مثال تیر اندازی کی تعریف کرے لیکن بزرگوں کی موجودگی نے اس کی زبان بند رکھی۔

ناظم صاحب نے ابان سے کہا:

''ابان! اب تم جا کے اپنا کام کرو اور ہاں آج شام تم اپنے والد کو میرے پاس ضرور بھیجنا۔''

ابان سلام کر کے واپس ہوا۔ اس کے دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔

ناظم صاحب اسے اپنے ساتھ کیوں لائے تھے؟

ابا جان کو انہوں نے کیوں بلایا ہے؟

یہ دونوں سوال دن بھر اسے پریشان کرتے رہے۔ اس کے دوستوں نے اسے بہت کریدا لیکن اس نے زبان نہ کھولی اور صاف ٹال گیا۔

شام کو وہ اپنے باہ کے پاس پہنچا اور انہیں ناظم صاحب کا پیغام پہنچایا۔ اس کے والد' ناظم صاحب کا پیغام سنتے ہی ملاقات کے لئے جانے کو تیار ہو گئے۔ وہ ایک عرصہ سے ناظم صاحب سے نہ ملے تھے۔ انہوں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا۔

کیمپ کے میدان میں اور وہاں سے واپس آنے کے بعد دونوں بھائیوں میں ابان کے بارے میں کافی گفتگو ہوئی۔ عتبہ ابان کی طرف سے بالکل مطمئن تھے۔ ناظم صاحب کو بھی ابان بہت پسند تھا۔ اب مسئلہ ابان اور اس کے والد کی رضامندی کا تھا۔ ناظم صاحب اس سلسلے میں بھی مطمئن تھے۔

ابان کے والد نماز مغرب کے بعد ملاقات کے لئے آئے۔ ناظم صاحب ان سے بڑے تپاک اور محبت سے ملے پھر ناظم نے عتبہ سے ابان کے والد کا تعارف

کرایا اور اشارے سے انہیں دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

ابان کے والد نے بڑے ادب سے پوچھا:

''قبلہ و کعبہ! فرمایئے آپ نے مجھے کیوں یاد فرمایا ہے؟ میں دل و جاں سے آپ کی ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔''

ناظم صاحب نے بے تکلفی سے کہا:

''بھئی جب تم میرے شاگرد تھے تو تم نے میری بات کبھی نہیں ٹالی تھی۔ امید ہے کہ اب بھی تم اسی جذبہ کی لاج رکھو گے۔''

''استادِ محترم! آپ کیا فرما رہے ہیں؟'' ابان کے باپ نے ادب سے جواب دیا۔ ''بات ماننا کیسا، آپ حکم دیجئے۔ میں بسر و چشم تعمیل کے لئے حاضر ہوں۔''

ناظم صاحب پہلے مدرسے میں پڑھاتے رہے تھے۔ اب فوجی تربیتی کیمپ کے ناظم تھے۔ ہمیشہ حکم ہی چلاتے رہے تھے لیکن یہ بھیجتی کا معاملہ تھا۔ وہ کہتے ہوئے جھجک رہے تھے۔

ابان کے باپ نے انہیں خاموش دیکھ کر کہا:

''محترم ناظم صاحب! میں شرم سے کٹا جا رہا ہوں۔ خدارا مجھے حکم دیجئے۔ آپ کیا چاہتے ہیں۔ کیا خواہش ہے آپ کی؟''

ناظم صاحب آہستہ سے بولے:

''میں ابان کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیجئے یہ بھی کوئی بات ہے'' ابان کے والد خوش ہوتے ہوئے بولے۔

''ابان جیسے میرا بیٹا ہے ویسے ہی آپ کا بھی ہے مجھے تو خوشی اس بات کی ہے کہ آپ کو ابان کا بھی اسی طرح خیال ہے جیسے آپ مجھ پر مہربان تھے۔''

ناظم صاحب نے جھجکتے ہوئے بات آگے بڑھائی:

''لڑکی تو میری نظر میں ہے اور مجھے پسند بھی ہے۔''

''یہ تو اور خوشی کی بات ہے استا محترم''۔ ابان کے والد نے جواب دیا۔ ''آپ کی پسند اور میری پسند الگ تھوڑی ہو سکتی ہے۔بس سمجھے رشتہ طے ہو گیا۔ امید ہے کہ ابان بھی رضامند ہو جائے گا۔''

ناظم صاحب مسکرائے:

''ابان کی رضامندی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔شرعی حیثیت سے بھی لڑکے اور لڑکی کی پسند معلوم کرنا ضروری ہے۔''

ابان کے والد کچھ سوچتے ہوئے بولے:

''لڑکی والوں سے کیا آپ نے بات کر لی ہے اور کیا ابان کو انہوں نے دیکھ لیا ہے؟''

ناظم صاحب نے کہا:

''ارے بھائی لڑکی والوں کی تم فکر نہ کرو۔لڑکی والا تو میں ہوں۔میرے بھائی کی بچی ہے۔وہی بھائی جس سے تم ابھی ملے تھے۔''

''پھر یہ تو گھر کی بات ہوئی۔''ابان کے والد نے کہا۔''میں آج ہی ابان سے پوچھ لوں گا۔آپ کا تو وہ یوں بھی بہت احترام کرتا ہے۔''

ابان کے والد کے رخصت ہونے کے بعد ناظم صاحب نے عتبہ کو بلوایا:

ناظم صاحب نے نوید دی۔

''ابان کے والد نے فوراً ہاں کر لی۔ امید ہے کہ کام بن جائے گا۔ اب تم فرض سے بھی آزاد ہو جاؤ گے اور تمہاری جہاد میں حصہ لینے کی خواہش پوری ہو جائے گی۔''

عتبہ کو جیسے اطمینان نہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے پوچھا:

''بھائی جان! کیا آپ کو امید ہے کہ یہ سب کچھ بالکل ایسے ہی ہو جائے گا جیسے آپ سوچ رہے ہیں؟''

''ارے اب شبہ کس بات کا ہے؟'' ناظم صاحب نے سمجھایا۔ ''انشاء اللہ ابان اور ثمن کی شادی ضروری ہو گی۔''

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے! عتبہ نے کہا اور خاموش ہو گئے لیکن پتہ نہیں ان کا دل اب بھی کیوں مطمئن نہ تھا۔

بنت عتبہ کو صبح ہی شبہ ہو گیا تھا کہ ابان کے والد کو ضرور کسی خاص وجہ سے بلایا گیا ہے۔ گھر پہنچ کے عتبہ نے کچھ اشاروں کنایوں میں بھی اسے سمجھایا۔ بیت عتبہ کو جب معلوم ہوا کہ ابان کے والد رضامند ہو گئے تو وہ بہت خوش ہوئی۔

ابان نے اسے پہلی ملاقات میں متاثر کر لیا تھا۔

دوسرے دن جب ابان کے والد جواب لے کے آئے تو ناظم صاحب کے پاس عتبہ بھی بیٹھے تھے۔ عتبہ نے اٹھ کر اندر جانا چاہا مگر ابان کے والد نے انہیں روک لیا اور متانت سے کہا۔

''بھائی عتبہ میرے لئے اس سے بڑھ کے اور کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ میں اپ

کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر اپنے گھر لے جاؤں۔ ابان بھی اسے اپنے لئے ایک بڑا اعزاز سمجھتا ہے۔ اس نے آپ کی بیٹی کی تیراندازی کا مظاہرہ بھی دیکھا ہے۔ وہ بنت عتبہ کی صورت، سیرت اور فن کا بھی مداح ہے۔ شادی کا بھی خواہش مند ہے لیکن اس نے شادی کے لئے ایک شرط رکھی ہے۔ اس کی بات اس قدر معقول ہے کہ میں اسے قائل نہ کر سکا''۔

عتبہ اور ناظم صاحب کے چہرے پر آئی ہوئی خوشی ناافسردگی میں بدل گئی۔

ناظم صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

''ابان کی طبیعت سے میں بھی واقف ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس نے کوئی غلط شرط لگائی ہوگی کہ اسے پورا کیا جائے۔''

ابان کے والد نے جواب دیا۔

''محترم! شاید میں نے شرط کا لفظ غلط استعمال کیا ہے۔ دراصل ابان نے اپنی ایک مجبوری کا اظہار کیا ہے۔ ابان کہتا ہے کہ اس کے پیر، جہاد کی رکاب میں ہیں اور سر پر شہادت کا کفن بندھا ہے۔ نہ معلوم کب محاذ پر جانا پڑے۔ ایسی صورت میں ''جہاد'' میرے لئے فرض ہے بلکہ مقدم ہے۔''

ناظم صاحب تو سن کر سوچ میں پڑ گئے لیکن عتبہ نے فوراً کہا۔

''سبحان اللہ۔ ابان کے کیا پاکیزہ خیالات ہیں لیکن اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ میری بیٹی بھی جہاد کی خواہشمند ہے۔ اگر شادی کے بعد دونوں میاں بیوی شریک جہاد ہوں تو شاید زیادہ اچھا ہو۔''

''محترم عتبہ۔'' ابان کے والد بولے۔ ''مجھے معلوم ہے کہ شادی تو میدان

جنگ میں بھی ہوتی ہے۔ میں نے ابان کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے کہا کہ میں ایک باسلیقہ لڑکی کو کچھ دن کا عیش دے کر اسے ہمیشہ کے لئے سوگوار نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے یہ ضرور وعدہ کیا ہے کہ اگر اسے شہادت نصیب نہ ہوئی اور وہ ایک سرخرو غازی کی طرح واپس آیا تو شادی صرف بنت عتبہ ہی سے کرے گا۔ اگر انتظار کیا جا سکے تو وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔''

عتبہ اور ناظم صاحب دونوں ہی لاجواب ہو گئے۔ جہاد کی مخالفت کر کے خدا اور رسول کی نظروں میں گرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

عربہ دل گرفتہ اٹھ کر بیٹی کو ابان کے فیصلے سے آگاہ کرنے گئے۔ بنت عتبہ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ عتبہ اسے کے سامنے جا کر چپ چاپ مجرموں کی طرح کھڑے ہو گئے۔

بیٹی نے پوچھا:

''بابا آپ افسردہ کیوں ہیں؟''

عتبہ بولے۔

''بیٹی! ابان کا جواب تم تک پہنچانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔''

''اس کی ضرورت بھی نہیں بابا۔'' بنت عتبہ نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''میں نے ابان کا فیصلہ سن لیا ہے۔''

''سن لیا ہے تم نے؟'' اور عتبہ بیٹی کا منہ دیکھنے لگے۔

''ہاں۔ بابا میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ بنت عتبہ نے کہا۔'' ابان نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے۔ وہ شوق شہادت سے سرشار ہیں۔ انہیں روکنا سخت گناہ ہو

گا۔ اس دنیا ن کی عشرت تو صرف دو روزہ ہے اور وہ ابدی مسرت کے متلاشی ہیں ۔وہ قطعی سیدھے راستے پر چل رہے ہیں مجھے کوئی افسوس نہیں ۔ میں ان کا عمر بھر انتظار کروں گی۔



خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے زکات دینا بند کردی تھی اور کچھ لوگ اسلام سے منحرف ہو گئے تھے لیکن عزم صدیق کے سامنے کسی کی ایک نہ چلی اور ایک ایک کر کے تمام فتنے دم توڑ گئے۔ فتنہ ارتداد اور جھوٹے نبیوں کے خاتمے کے بعد خلیفتہ المسلمین نے روم اور شام کی طرف توجہ کی ۔وہاں کے حالات کے پیش نظر آپ نے چار لشکر ترتیب دیئے اور انہیں حمص' فلسطین' دمشق اور اردن روانہ کیا۔

مجاہدین کے ان لشکروں پر عرب کے چار نامور سردار مقرر کئے گئے تھے۔ ایک لشکر حضرت ابوعبیدہ کی زیر کمان تھا۔ انہوں نے جابیہ پہنچ کے اپنا مورچہ لگایا۔ یزید بن ابو سفیان بلقا پہنچے۔ سرجیل بن حسنہ بسرہ میں خیمہ زن ہوئے اور عمرو بن عاص وادی عربہ میں داخل ہوئے ۔اس طرح مسلمان فوجوں نے ملک شام اور ارض روم کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ حضرت خالد بن ولید پہلے ہی ایرانیوں کو پیہم شکستیں دیتے ہوئے حیرہ اور فراض تک پہنچ چکے تھے۔

رومیوں اور شامیوں نے اپنے آپ کو چاروں طرف گھیرا ہوا دیکھا تو وہ قیصر روم شہنشاہ ہرقل کے دربار میں فریاد لے کر گئے اور مسلمانوں سے مقابلے کے لئے

درخواست کی۔ شہنشاہ روم بڑا جہاندیدہ تھا۔ اس کے کانوں میں مسلمان کی ایران میں فتوحات کی خبریں پڑ چکی تھیں۔ وہ مسلمانوں کے "جوش جہاد" اور سرفروشی سے بہت خائف تھا اور جنگ کے لئے آمادہ نہ تھا۔ اس نے اپنے سرداروں پر زور دیا کہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے بجائے انہیں کچھ لے دے کے صلح کر لی جائے۔ ہرقل کو شاید اپنی شکست کا پہلے ہی یقین ہو گیا تھا۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کا مطلب ہے کہ ہمیں شام اور روم کے خراج سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

رومی اور شامی سردار اگر شہنشاہ ہرقل کا مشورہ مان لیتے تو شاید یہ جنگ رک جاتی لیکن وہ تو جنگ پر بضد ہوئے اور ہرقل کو مجبور ہو کر مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہونا پڑا۔ ہرقل اس وقت بیت المقدس میں تھا۔ وہ وہاں سے حمص آیا اور لشکر اکٹھا کرنا شروع کیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اسلامی لشکر چار حصوں میں تقسیم ہے ہے تو اس نے بھی اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور چار فوجیں بنا کر مسلمانوں کے مقابلے پر بھیجیں۔

ہرقل نے اپنے بھائی تذارق کو نوے ہزار فوج کے ساتھ عمرو بن عاص کے مقابلے پر، پچاس ہزار فوج کے ساتھ جرجیہ بن تو در کو یزید بن ابی سفیان کے مقابلے پر، قیقابن نسطورس کو ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ ابوعبیدہ کے مقابلے پر اور چالیس ہزار فوج کے ساتھ درأقص کو شرجیل بن حسنہ کے مقابلے پر روانہ کیا۔

مسلمانوں کو علم ہوا کہ ان کی ہر فوج کے مقابلہ پر اس سے دوگنی فوج ہرقل نے بھیجی ہے تو انہوں نے آپس میں صلاح ومشورہ کیا۔ تیز رفتار قاصد ایک کا پیغام

دوسرے تک پہنچاتے رہے۔ چار مسلمان سرداروں میں عمرو بن عاص کی ذہانت کے سبھی قائل تھے۔ انہوں نے رائے دی کہ الگ الگ مقابلے کے بجائے ہم سب کو یکجا ہو جانا چاہئے۔ اس طرح ہم تعداد کی کمی کی وجہ سے مغلوب نہ ہو سکیں گے۔ اس مشورہ کو سب نے پسند کیا اور دربار خلافت سے اس کی منظوری کے لئے ایک قاصد روانہ کیا گیا۔ قاصد کے ذریعہ مدینہ سے مزید کمک بھی منگوائی گئی۔

مدینہ میں جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ اسلامی لشکر کو کمک بھیجی جا رہی ہے تو مجاہدین اسلام کے دل جوش جہاد سے ابھر گئے۔ مدینہ اور طائف کی چھاؤنیوں میں دھڑا دھڑ جوان پہنچنے لگے۔ ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ اسے کمک کے دستوں میں شامل کیا جائے۔ اس طرح صبح سے شام تک میلہ سا لگا رہتا۔ انتخاب شروع ہوا تو ان جوانوں کو سب سے پہلے شامل کیا گیا جو عرصہ سے زیر تربیت تھے۔ ابان کے دل کی مراد بر آئی تھی اس کا انتخاب ہو گیا تھا۔

ادھر خلیفۃ المسلمین نے محاذ پر گئے ہوئے سرداروں کی درخواست قبول کرتے ہوئے انہیں یکجا ہو جانے کا حکم بھیج دیا۔ ایک قاصد حضرت خالد بن ولید کے پاس بھیجا گیا۔ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ عراق کے محاذ سے آدھا لشکر لے کر رومیوں اور شامیوں کے مقابلے پر روانہ ہو جائیں۔ ادھر مدینہ میں پانچ ہزار کا ایک لشکر تیار کیا گیا اس کی سرداری کے فرائض خالد بن سعید کے سپرد کئے گئے (واضح رہے کہ یہ خالد بن سعید ہیں' خالد بن ولید نہیں ہیں۔)

ابان ابھی جوان تھا۔ اس کے پوشیدہ جوہر ابھی تک سامنے نہ آئے تھے۔ پس وہ معمولی سوار دستوں میں شامل ہو کر خالد بن سعید کے ساتھ محاذ کی طرف

روانہ ہوا۔ خالد بن سعید کو عمرو بن عاص کے پاس پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا۔ پس وہ منزلیں مارتے ارضِ عرب کی طرف چلے جس کے نواح میں عمرو بن عاص مقیم تھے۔ تیسر منزل پر انہوں نے ایک مناسب میدان دیکھ کر خیمہ زن ہونے کا حکم دیا۔ ذرا ہی دیر میں پورا میدان خیموں سے بھر گیا۔ خیموں کے آگے آگ روشن کر دی گئی۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔

ابان کا دل جوش جہاد سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے دوست مختلف دستوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ابان ہر منزل پر ان سے ملنے جاتا تھا اور ان سے اس طرح ہنس ہنس کے باتیں کرتا جیسے میدان جنگ کے بجائے وہ کسی بارات میں جا رہا ہے۔ اسی دوران ابان ایک دوست کا خیمہ تلاش کر رہا تھا کہ ایک جگہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا یہ عتبہ ہیں؟'' ابان نے اپنے دل سے سوال کیا۔

اور پھر خود ہی جواب دیا:

''نہیں۔ وہ نہیں۔ انہیں تو محاذ پر جانے کی اجازت نہ ملی تھی۔''

لیکن وہ عتبہ ہی تھے۔ عتبہ بھی شاید کسی کا خیمہ تلاش کر رہے تھے۔ ابان اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لئے ایک خیمے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ عتبہ اس کے قریب سے گزر کر آگے نکل گئے۔ اب ابان کو یقین کرنا پڑا کہ وہ عتبہ ہیں لیکن اب ان سے ملتے ہوئے اسے شرم آ رہی تھی۔ اس نے شادی سے انکار کیا تھا۔ وہ بنت عتبہ جیسی خوبصورت لڑکی کو قبول نہ کر سکا تھا لیکن اس میں اس کی کیا خطا تھی۔ کیونکہ جہاد اول ہے اور شادی بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔

ابان نے آخر ان سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ عتبہ قدم بقدم دور ہوتے جا رہے تھے۔ پس اس نے عتبہ کی طرف تیز قدم بڑھائے لیکن اس کے ساتھ ہی خیال آیا:۔

''بنت عتبہ نے اس انکار پر اس کے بارے میں کیا سوچا ہو گا؟''

یہ خیال آتے ہی عتبہ کے قدم رک گئے۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی کشمکش تھی۔ اک تذبذب کا عالم تھا۔ ایک دل کہتا عتبہ سے ملو۔ دوسرا منع کرتا۔ آخر عتبہ ایک خیمے کی آڑ میں ہو گئے۔

ابان نے ہمت کی اور تیز قدم اٹھاتا اس خیمے کے پاس پہنچ گیا۔ پھر وہ خیمہ سے آگے بڑھا تو عتبہ اسے ایک آدمی سے گفتگو کرتے نظر آئے۔ عتبہ چپ چاپ ان کے سامنے چلا گیا مگر اس کی نظریں نیچی تھیں۔

عتبہ کی نظر دوسرے آدمی سے گفتگو کرتے ہوئے ابان پر پڑی تو وہ خوش ہو گئے۔ بولے:

''ارے ابان تم؟''

اور انہوں نے بغلگیر ہونے کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے۔

ابان جھجکتا ہوا ان کے سینے سے لگ گیا۔

پھر ابان ان کے سینے سے الگ ہوتے ہوئے بولا:

میں سمجھا تھا کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔

''کیوں۔ اس میں ناراض ہونے کی کیا بات تھی؟'' عتبہ نے جواب دیا۔

''تم نے جو جواب دیا اس سے ہم خوش۔ ہمارا خدا خوش۔ تمہارے فیصلے کو میری بیٹی

نے بھی پسند کیا ہے۔"

"بنت عتبہ" جیسے ابان کے دل سے ایک آواز ابھری۔ اس نے چاہا بنت عتبہ کے بارے میں ان سے کچھ پوچھے لیکن حجاب مانع رہا۔

پھر بھی ابان نے کہا:

"محترم۔آپ لشکر کے ساتھ کیسے آ گئے؟ آپ کو میدان جنگ میں جانے کی تو اجازت نہیں ملی تھی۔"

عتبہ نے جواب میں بتایا:

"ہاں بیٹے پہلے تو خلیفۃ المسلمین نے انکار کر دیا تھا مگر اس دفعہ میں نے ہاتھ پیر جوڑ کے آخر انہیں رضامند کرلیا۔اللہ خلیفۃ المسلمین کا سائیہ ہمارے سروں پر قیامت تک قائم رکھے۔"

ابان کے دل میں پھر گدگدی سی پیدا ہوئی کے بنت عتبہ کے بارے میں کچھ پوچھے مگر اسے ہمت نہ ہوئی۔

اگلی منزل پر دونوں کی پھر ملاقات ہوئی اور ذرا کھل کے باتیں ہوئیں۔ابان کو معلوم ہوا کہ بنت عتبہ بھی لشکر کے ساتھ ہے۔اسے خواتین کے لشکر من شامل کر لیا گیا ہے۔خواتین کے خیمے لشکر سے ذراہٹ کر لگائے جانے تھے لیکن اس سے اگلی مزل پر ابان اور بنت عتبہ کا اتفاقیہ آمنا سامنا ہو گیا۔

ابان نے شرم یا لحاظ کی وجہ سے نظریں نیچی کرلیں۔دوسری طرف بنت عتبہ نے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہ ہونے دیا۔

اب تو ہر منزل پر دور ہی دور سے ان کی ملاقات ہوتی لیکن یہ ملاقاتیں

نظروں کے ملاپ سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ خالد بن سعید کی اصل منزل ارض عربہ تھی جہاں عمرو بن عاص پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ ارض عربہ ابھی کئی منزل دور تھی۔ خالد بن سعید کو وہاں پہنچنے کی جلدی تھی۔ انہوں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ ابھی تین منزلیں باقی تھیں کہ چاروں طرف پھیلے ہوئے جاسوس سواروں نے خالد بن سعید کو ایک ایسی اطلاع پہنچائی جس سے وہ ذرا دیر کے لئے پریشان ہو گئے۔

ایک جاسوس نے خالد بن سعید کو بتایا:

''دس بارہ ہزار کا ایک رومی لشکر بڑی تیزی سے مسلمانوں کے عقب میں بڑھا چلا آ رہا ہے۔''

اس اطلاع پر خالد بن سعید نے اپنے خاص خاص سرداروں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ بعض نے رائے دی کہ ہمیں خیمے اکھاڑ کر فوراً ارض عربہ کی طرف کوچ کر جانا چاہئے تا کہ ہمیں عمرو بن عص کی مدد حاصل ہو جائے۔ ان سرداروں کی دلیل یہ تھی کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد صرف پانچ ہزار ہے جبکہ عقب میں آنے والے رومیوں کی تعداد دس بارہ ہزار کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس قلیل تعداد سے دشمنوں کا مقابلہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

دوسری رائے اس کے بالکل برعکس تھی۔ رائے دینے والے یہ سوار تجربہ کار نہ تھے لیکن ان کی رگوں میں جوانی کا خون گردش کر رہا تھا اور ان کے سینے جہاد کے جوش سے پھٹے جاتے تھے۔ ان سب نے جنگ کے حق میں آواز بلند کی۔ انہوں نے رائے دی کے قریب ہی کوئی مناسب مقام دیکھ کر ہمیں مورچہ لگانا چاہئے اور اللہ کے بھروسے پر دشمن سے مقابلہ کرنا چاہئے کیونکہ اگر ہمیں منزل پر

پہنچنے سے پہلے ہی دشمن نے گھیر لیا تو افراتفری کا خطرہ ہے اور پھر ہم اپنی مرضی کا میدان بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔

آخر خالد بن سعید نے جوانوں کے گروہ سے اتفاق کیا اور کسی معقول میدان کی تلاش میں فوراً دوڑ ائے۔

ادھر شہنشاہ ہرقل مسلمانوں کی نقل و حرکت سے غافل نہ تھا۔ مسلمانوں کے چار لشکروں کے مقابلے میں اس نے بھی چار زبردست لشکر روانہ کر دیئے تھے۔ پھر جب اسے یہ خبر ملی کہ مدینے سے ایک تازہ دم فوج کمک کے طور پر بھیجی گئی ہے جس کا رخ ارض عربہ کی طرف ہے تو اس نے فوراً بارہ ہزار کا مزید لشکر ترتیب دے کر ایک مشہور رومی سردار قیقلان کے سپرد کر کے حکم دیا کہ مدینہ سے آنے والی کمک کو راستے ہی میں روک لے تا کہ یہ کمک عمرو بن عاص کو حاصل نہ ہو سکے۔ قیقلان بڑی تیزی سے آگے بڑھا کہ کمک اور عمرو بن عاص کے لشکر کے درمیان حائل ہو جائے لیکن خالد بن سعید آگے نکل چکے تھے اس لئے وہ تعاقب کرتا ہوا خالد بن سعید کے پاس پہنچ گیا۔

خالد بن سعید' اجنادین کے میدان میں اپنے مورچے لگا چکے تھے اور رومیوں کا انتظار کر رہے تھے رومیوں کا لشکر شام کے وقت پہنچا اور مسلمانوں کے سامنے خیمہ زن ہو گیا۔ خالد بن سعید نے رات کے لئے بہت زبردست حفاظتی انتظام کئے۔ خصوصاً انہوں نے خواتین کے خیموں کے گرد کافی پہرہ لگا دیا تا کہ اگر شب خون مارا جائے تو اس کا تدارک ہو سکے۔

مگر رات کو کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ کسی طرف سے بھی شب خوں مارنے کی

کوشش نہیں کی گئی۔ رومیوں کے پڑاؤ میں حسب دستور کافی رات تک شراب کا دور چلتا رہا۔ مسلمانوں کی قلیل تعداد کے پیش نظر انہیں اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا اور شاید وہ پہلے ہی فتح کا جشن منانے لگے تھے۔ مسلمانوں نے اس رات بہت کم آرام کیا۔ صحابہ کرام کی ایک کثیر تعداد اس لشکر میں موجود تھی وہ سب کے سب تمام رات توبہ واستغفار اور تسبیح اور درود میں مصروف مسلمانوں کی فتح ونصرت دعائیں مانگتے رہے۔

صبح کو نماز سے فارغ ہوتے ہی خالد بن سعید نے صفیں ترتیب دیں۔ رومی بھی کیل کانٹے سے درست ہو کر مقابلے پر آئے۔ مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ ان کے گھوڑے رانوں سے نکلے جاتے تھے۔ تلواریں بے نیام ہونے کے لئے بے چین تھیں۔ حملے کا حکم ہوا تو مسلمان بھوکے شیروں کی طرح دشمن پر جا پڑے۔ اس گھمسان کا دن پڑا کہ زمین وآسمان کانپ اٹھے۔ جو سوار تجربہ کار تھے اور لڑائیوں میں پہلے بھی شریک ہو چکے تھے وہ تو سنبھل سنبھل کے حملے کر رہے تھے لیکن منچلے جوان جن کا یہ پہلا موقعہ تھا انہیں آگے پیچھے کا کوئی ہوش نہ تھا اور خیال تھا تو بس یہ ایک بھی دشمن کا سپاہی میدان میں زندہ نہ رہنے پائے۔

نوجوان ابان کی تلوار بجلی کی طرح کوند رہی تھی۔ اس نے کچھ ایسی دلیری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ جوان سرداروں نے جنگ کو ترجیح دی تھی ان کا مشورہ کامیاب ہوا اور دوپہر ڈھلے رومی لشکر کئی ہزار لاشیں میدان میں چھوڑ کے بھاگ نکلا۔ خالد بن سعید نے فوج کو مصلحتاً بھاگنے والوں کے تعاقب سے روک دیا لیکن اس وقت تک ابان رومی سپہ سالار قیقلان تک پہنچ

چکا تھا۔قیقلان نے لشکر کو بھاگتے دیکھا تو وہ خود بھی بھاگنے کی فکر میں لگ گیا۔اس وقت ابان کے ساتھ چار پانچ اور جیالے تھے۔وہ سب ریلا کر کے قیقلان کے قریب پہنچ گئے۔اس نے بھاگ نکلنے کی بہت کوشش کی لیکن ابان کے دو تین وار اس کے شانے پر ایسے پڑے کہ قیقلان بے دم ہو کر زین سے لٹک گیا اور ابان نے بڑھ کر اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

اب مسلمان فتح سے سرشار ہو کر اپنے خیموں کی طرف واپس ہوئے قیقلان کا سر ابان کے قبضے میں تھا۔

اس غیر متوقع جنگ میں فتح کی وجہ سے سپہ سالار خالد بن سعید بے حد مسرور تھے۔اب وہ اپنے خیمے کے باہر بیٹھے تھے۔بارہ ہزار کے مقابلے میں پانچ ہزار کی کامیابی اس قدر شاندار تھی کہ خالد بن سعید خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے اور پھر جب رومی سپہ سالار قیقلان کا سر ان کے قدموں میں ڈالا گیا تو ان کی مسرت کا عالم دیدنی تھا۔کبھی وہ سر کو دیکھتے اور کبھی سر لانے والے جوان کو۔ان کے تمام سردار ابان کو تحسین بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

خالد بن سعید کھڑے ہوتے ہوئے ابان سے بولے:

''خوش نصیب۔کیا نام ہے تمہارا؟''

''ابان''اور ابان نے جواب دے کر نظریں جھکا لیں۔

''کس علاقے سے تعلق ہے تمہارا؟''

''طائف کی چھاؤنی سے میرا انتخاب ہوا ہے۔''

''طائف۔''خالد مسرت سے بولے۔''سبحان اللہ۔طائف کی زمین پہلے

ہی متبرک تھی۔ میں اس مقدس زمین کے بہادر جوان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے خالد بن سعید نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ ابان جھجکتا ہوا ان کی طرف بڑھا اور ان کے سینے سے لگ گیا۔

خالد نے پوچھا:

''ابان۔ کس عہدے پر فائز ہو؟''

جس سوار دستے سے ابان کا تعلق تھا اس کا سردار وہاں کھڑا تھا۔ چنانچہ ابان کے بجائے اس نے جواب دیا۔

''سالار محترم۔ ابان میرے دستے میں شامل ہے۔ میدان جنگ میں پہلی بار آیا ہے۔''

''سبحان اللہ۔ سبحان اللہ'' خالد بولے۔ ''ابان کی غیر معمولی شجاعت کے پیش نظر ہم اسے بیس سواروں کا سردار مقرر کرتے ہیں۔''

ابان کے اس اعزاز کو سب نے پسند کیا۔

اجنادین کی پہلی جنگ میں کافی تعداد میں صحابہ کرام شریک تھے۔ ان میں بیشتر نے اس جنگ میں شہادت پائی۔ خالد بن سعید شہیدوں کی لاشو کے پاس پہنچے۔ وہ کثیر تعداد میں صحابیوں کی لاشیں دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے۔

انہوں نے حکم دیا:

''ہر صحابی کے لئے الگ قبر تیار کی جائے۔''

مقتولین کی تجہیز و تکفین کے حکم دینے کے بعد خالد بن سعید زخمیوں کے خیمے

کے طرف چلے۔ ہر خیمے میں چار زخمیوں کو رکھا گیا تھا۔ کچھ کی مرہم پٹی ہو چکی تھی اور بعض کے زخم صاف کر کے پٹیاں باندھی جا رہی تھیں۔ خواتین اسلام بڑی توجہ سے زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھیں۔

ایک خیمے میں کئی آدمی ایک زخمی پر جھکے ہوئے تھے۔ خالد خیمے میں داخل ہوئے تو تمام لوگ ادب سے کھڑے ہو گئے۔ زخمی کے جسم پر بے شمار زخم تھے۔ اس کا پورا بستر اور کپڑے خون میں لت پت تھے۔ زخموں سے خون اب تک جاری تھا۔ زخمی بے ہوش تھا۔ اس کی سانس بہت آہستہ چل رہی تھی۔

خالد نے جھک کر زخمی کو دیکھا پھر کچھ سوچنے لگے۔

ایک سردار سے پوچھا:

''کیا نام ہے ان کا؟''

''عتبہ......مدینے کے رہنے والے ہیں۔'' قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی نے جواب دیا۔

''عتبہ......ہاں یہ عتبہ ہیں۔'' خالد بن سعید کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ ''کیسی حالت ہے ان کی؟''

''خون بہت بہہ گیا ہے۔'' پٹی باندھنے والے نے جواب دیا۔ اللہ اپنا رحم کرے''۔

''انہیں بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔'' خالد نے فرمایا۔ ''ان کی دیکھ بھال کی مجھے خاص تاکید کی گئی ہے۔''

پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے:

''مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان کے ساتھ ان کی بیٹی بھی آئی ہوئی ہے۔''

اس وقت کئی آدمیوں کی نظریں ایک ساتھ خیمے کے کونے کی طرف اٹھیں جہاں ایک لڑکی سر جھکائے کھڑی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ خالد کے قریب آ گئی۔

''تم عتبہ کی بیٹی ہو۔'' اور خالد نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

اور بنت عتبہ نے ایک سسکی بھر کر سر جھکا دیا۔

خالد بن سعید زخمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''تمہارے والد محترم کو شہادت کی بڑی آرزو تھی۔ انہیں بچانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ آگے اللہ کی مرضی۔ لیکن یہ خیال رکھو کہ تم صرف عتبہ کی بیٹی نہیں، ہماری بھی بیٹی ہو۔ تمہیں کوئی بھی پریشانی نہیں ہوگی''۔

اس وقت زخمی کو ہلکی سی کھانسی آئی اور کھانسی کے ساتھ ہی تھوڑا سا خون ناک اور منہ سے باہر آ گیا۔ خالد بن سعید ان پر جھک گئے۔ زخمی کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی اور آنکھیں آہستہ آہستہ کھل گئیں۔ بنت عتبہ جلدی سے باپ سے لگ کر بیٹھ گئی۔

خالد بن سعید نے عتبہ سے کہا:

''محترم عتبہ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

عتبہ نے نحیف آواز میں رک رک کے دریافت کیا:

''جنگ کا کیا نتیجہ ہوا؟''

''مبارک ہو آپ کو........'' خالد جلدی سے بولے۔ ''خدا نے ہمیں کامیابی

سے ہمکنار کیا۔''

عتبہ کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ایک لمحے کے لئے ان کی آنکھیں بند ہوئیں پھر ذرا سنبھل کے بولے:

''میری آرزو بھی پوری ہوگئی۔ میں بھی منزل کے قریب پہنچ گیا ہوں۔

پھر عتبہ نے نظریں اس طرح گھمائیں جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔

''آپ کی بیٹی۔ آپ کے سینہ سے لگی بیٹھی ہے''۔ انہیں بتایا گیا۔

''ہاں بابا'' کہہ کر بنت عتبہ نے اپنا ہاتھ باپ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''میں آپ کے قریب ہوں۔''

''سپہ سالار'' عتبہ کے منہ سے نکلا پھر ان پر غشی طاری ہوگئی۔

خالد بن سعید اپنا منہ ان کے قریب لا کر بولے:

''محترم عتبہ فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔''

عتبہ نے پھر آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے بولے:

''ایک وعدہ کیجئے مجھ سے''

''حکم دیجیے محترم......'' خالد جلدی سے بولے

''میری بیٹی کسی کی امانت ہے'' عتبہ نے رک رک کے کہا۔ ''میرے بعد امانت اس تک پہنچا دیجئے گا۔''

''بالکل فکر نہ کیجئے محترم عتبہ۔'' خالد نے انہیں مطمئن کرنے کے لئے کہا۔ ''آپ کی بیٹی کو میں اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔ جہاں کہئے وہاں پہنچا دیا جائے گا۔''

عتبہ کی آواز ڈوب رہی تھی۔ وہ زور لگا کر بولے۔ ''لشکر میں ایک سوار ابان

ہے۔ یہ اس کی امانت ہے۔''

''ابان'' خالد نے مسرت سے دہرایا۔ ''محترمہ عتبہ۔ آپ کی بیٹی خوش نصیب ہے۔ ابان نے رومی لشکر کے سپہ سالار قیقلان کا سر اتارا ہے۔ اور ہم نے ابھی اسے بیس سواروں کا سردار مقرر کیا ہے۔''

عتبہ کے جسم میں جیسے طاقت سی آ گئی۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

خالد بن سعید نے حکم دیا:

''ابان کو فوراً یہاں لایا جائے۔''

لوگ دوڑ کے ابان کو وہاں لے آئے۔ ابان کی نظر سپہ سالار اور بنت عتبہ پر پڑی۔ بنت عتبہ ابان کو دیکھ کر سمٹ گئی۔

خالد بن سعید نے کہا:

''ابان۔ تم محترم عتبہ کو جانتے ہو؟''

ابان کی نظریں زخمی عتبہ پر پہلے ہی سے جمی تھیں۔ اس نے جواب دیا۔

''جی ہاں سپہ سالار۔ میں محترم عتبہ اور بنت عتبہ دونوں کو جانتا ہوں۔ کیا عتبہ بہت زخمی ہوئے ہیں۔'' اور ابان عتبہ پر جھک گیا۔

''ابان'' خالد بولے۔ ''محترم عتبہ کو بعد میں دیکھنا۔ اس وقت تو ان کے زخموں کو مرہم کی ضرورت ہے اور وہ مرہم صرف تم مہیا کر سکتے ہو۔''

''فرمایئے سپہ سالار......'' ابان جلدی سے بولا۔ ''میں محترم عتبہ کے لئے جان تک دے سکتا ہوں'' خالد بن سعید نے ابان کے چہرے پر نظریں جماتے

ہوئے کہا۔

محترم عتبہ نے ایک امانت میرے سپرد کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ امانت اسی وقت اس شخص کو پہنچا دوں جس کے لئے انہوں نے حکم دیا ہے۔

ابان کی سمجھ میں سپہ سالار کی بات اچھی طرح نہ آسکی۔ اس نے پوچھا:

''میرے لئے کیا حکم ہے سپہ سالار؟''

خالد بن سعید متانت سے بولے:

''ابان۔ شیر سے پنجہ لڑانے والے کے سینے میں ہمیشہ ایک دردمند دل ہوا کرتا ہے۔ محترم عتبہ کی امانت ان کی بیٹی ہے۔ اس کی حفاظت میں نے قبول کی ہے۔ اب میں یہ امانت تمہارے سپرد کررہا ہوں۔ تم اس کے اہل بھی ہو اور عتبہ کی بھی یہی آرزو ہے''۔

ابان نے گھبرا کے عتبہ کے چہرے پر نظر ڈالی۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان دھندلائی ہوئی آنکھوں میں ابان نے بڑے ادب سے سپہ سالار کو مخاطب کیا۔

''محترم سپہ سالار۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں محاذ سے غازی بن کر واپس آیا تو بنت عتبہ کو اپنے نکاح میں لاؤں گا۔ مجھے علم نہ تھا کہ حالات ایسی کروٹ بدلیں گے۔ میں محترم عتبہ کی آرزو پوری کرنے پر آمادہ ہوں۔''

''شاباش ابان'' سپہ سالار کے سر سے جیسے بوجھ سا اتر گیا۔ ''ہم نے تمہارے بارے میں ٹھیک ہی اندازہ لگایا تھا۔ خدا تمہیں اس سے زیادہ عظمت عطا کرے۔''

اور خالد بن سعید نے اس وقت بنت عتبہ اور ابان کا خود ہی نکاح پڑھا دیا۔

پھر جب سب لوگ خیمے سے چلے گئے تو ابان عتبہ کے بستر کے دوسری طرف بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ عتبہ کے سینے پر رکھا۔ عتبہ کی آنکھیں اس وقت تک کھلی تھیں جب نکاح پڑھایا گیا تو ان پر ضعف کا دورہ پڑا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ رات کے کسی حصہ میں بنت عتبہ کا ہاتھ ابان کے ہاتھ پر آ گیا لیکن مسرت کی ان گھڑیوں میں تمام رات موت کا سایہ منڈلاتا رہا۔ عتبہ کے ڈوبتے دل اور اکھڑی سانسوں کو دیکھ کر ہی انہوں نے پوری رات آنکھوں ہی میں کاٹ دی۔ صبح دم فجر کی اذان کے ساتھ ہی عتبہ کی آرزوئے شہادت پوری ہو گئی اور وہ آخری ہچکی لے کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ملک شام میں غور کے قریب یرموک نام کی ایک وادی ہے۔ حضرت ابوبکر کے حکم کے مطابق مسلمانوں کے چاروں لشکر یکجا ہونے کے لئے اس وادی کی طرف چلے۔ شہنشاہ روم ہرقل نے بھی اپنے تمام لشکر یرموک کی طرف بھیج دیئے تھے۔ رومی فوجیں واقو صہ کے مقام پر آ کر ٹھہر گئی تھیں۔ پھر دوسرے دن اسلامی لشکر بھی وادی میں داخل ہوا اور رومیوں کے سامنے مورچے لگائے۔ 13 ہجری صفر کے مہینے سے ربیع الثانی یعنی پورے تین ماہ تک دونوں فوجیں آمنے سامنے مورچے جمائے رہیں لیکن کسی نے دوسرے پر حملہ کرنے کی کوشش نہ کی۔

خالد بن سعید اجنادین کی فتح کے بعد ارض عربہ میں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے تمام لشکر یرموک جا چکے ہیں۔ عمرو بن عاص نے ان کے لئے یہ پیغام چھوڑا تھا کہ وہ بھی بے جھجک یرموک کی طرف چل پڑیں۔ چنانچہ خالد بن

سعید نے فوراً اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ اس مشورے میں انہوں نے ابان کو بھی شریک کیا۔ جواں عمر ابان کو بنت عتبہ کے ساتھ شادی کے بعد سوسواروں کا رسالدار مقرر کر دیا گیا تھا۔ پس اتفاق رائے کے بعد خالد بن سعید نے بھی اپنے گھوڑوں کے رخ یرموک کی طرف موڑ دیئے اور وہ بہت جلد وہاں پہنچ گئے۔ مسلمانوں کو اس کمک سے بہت خوشی ہوئی۔

لشکر اسلام کے تمام جواں عمر مجاہدین جنگ کے لئے بڑے بے چین تھے مگر کیفیت یہ تھی کہ دونوں لشکر صبح کو تیار ہو کر نکلتے۔ صفیں درست کی جاتیں اور شام تک اسی عالم میں دوسری طرف سے جنگ کے آغاز کا انتظار ہوتا۔ پھر واپسی کا بگل بجتا اور دونوں لشکر اپنی اپنی خیمہ گاہ میں واپس آ جاتے۔

مدینہ سے کمک آ جانے کے باوجود مسلمانوں نے جنگ میں پہل نہیں کی۔ لشکر کے اصل دماغ عمرو بن عاص تھے انہوں نے تمام سرداروں کو سمجھایا اور انہیں جنگ شروع کرنے سے روکے رکھا۔ اس دوران خالد بن سعید کو مدینہ سے حکم ملا انہوں نے ابن حارثہ کو اپنا قائم مقام بنایا اور خود دس ہزار فوج لے کر عراق سے شام کی طرف چل پڑے۔ خالد بن سعید کو ہر چند یرموک پہنچنے کی جلدی تھی لیکن ان کی شمشیر آبدار راستے میں بھی نیام کے اندر نہ رہ سکی۔ ارک اور تدمر مغلوب ہوئے۔ مرج واہط کے قلعہ دار نے سرکشی دکھائی تو اسے تاخت وتاراج کیا پھر غوطہ فتح کر کے وہ بصریٰ میں داخل ہوئے۔ بصریٰ شام کا پہلا شہر تھا جو خالد بن سعید کے ہاتھوں فتح ہوا۔

میدان جنگ میں اس طویل خاموشی سے قیصر روم ہرقل نے فائدہ اٹھایا۔

اس نے روم کے ایک مشہور سردار ابابان کی زیر کمان ایک اور لشکر روانہ کر دیا۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد چھتیس (36) ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ ان کے مقابلے میں رومی لشکر دو لاکھ چالیس ہزار تھا۔ جس میں روم کے تمام بڑے بڑے سرداروں کے علاوہ عیسائی پادریوں کی بھی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ مسلمانوں اور رومیوں کی یہ پہلی عظیم جنگ تھی جس کا فیصلہ بڑا دور رس نکلنا تھا۔

جنگ شروع ہونے سے ایک دن پہلے تمام مسلم سرداران لشکر کا ایک اجلاس ہوا۔ اس میں جنگ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ ہر سردار نے اپنی رائے پیش کی۔ خالد بن سعید سب کی باتیں سنتے رہے جب سب بول چکے تو عمرو بن عاص نے خالد بن سعید کا مشورہ طلب کیا۔

خالد بن سعید نے سرداروں کو مخاطب کر کے فرمایا:

''یہ جنگ ایک عظیم مذہبی جنگ ہے۔ آج ہمیں فخر اور نافرمانی کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے اور صرف اللہ کے واسطے اپنی تمام کوششیں صرف کرنا چاہئیں۔ دیکھو دشمن تنظیم اور ترتیب کے ساتھ میدان جنگ میں موجود ہے اور تم متفرق ہو۔ تمہارا یہ انتشار تمہارے لئے دشمن کے حملے سے زیادہ نقصان پہنچانے والا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ساری فوج کی امارت ایک امیر کی کمان میں دیدی جائے اور فوج کی امارت باری باری تقسیم کر لی جائے۔ ایک دن ایک امیر، سردار ہو تو دوسرے دن دوسرا سردار امیر بنایا جائے۔ اگر تمہیں یہ رائے پسند ہے تو آج مجھے امیر بن جانے دو۔

اسلامی لشکر کے سردار نے خالد بن سعید کی رائے کو پسند کیا۔ سب سے پہلے

ان کی امارت عمرو بن عاص نے تسلیم کی۔ اس کے بعد باقی تمام سرداروں نے خالد بن سعید کو اپنا امیر مان لیا۔

رومی بڑی آن و بان کے ساتھ میدان میں صف آرا ہوئے۔ خالد بن سعید نے اپنے لشکر کو اس طرح ترتیب دیا کہ اس سے قبل کبھی لشکر کو اس طرح مرتب نہ کیا گیا تھا۔ خالد بن سعید نے مردوں کے علاوہ خواتین کا بھی ایک دستہ ترتیب دیا۔ خالد بن سعید کا خیمہ ایک بلند مقام پر تھا۔ انہوں نے خواتین کو حکم دیا کہ وہ پتھر اکٹھا کرلیا اور ضرورت پڑے تو خیموں کی چوبیں بھی اکھاڑ لیا۔ پھر ان کے سپرد یہ کام ہوا کہ جنگ کے دوران وہ اونچے ٹیلے پر کھڑی رہیں اور جو مسلمان میدان جنگ سے منہ پھیرے اس کی خبر پتھروں اور خیمے کی چوبوں سے لیں۔ اور کسی کو بھی بھاگنے کا موقعہ نہ دیں۔

ان خواتین میں بنت عتبہ بھی تھی۔ اس کا محبوب شوہر ابان اس وقت شرجیل بن حسنہ کے دستوں میں شامل تھا۔ بنت عتبہ نے تیر کمان لے کر میدان جنگ میں جانے کی اجازت مانگی تھی مگر اسے اس کی اجازت نہیں دی گئی اور اسے خواتین کے دستے کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس طرح بنت عتبہ کی جنگ (جہاد) کی آرزو اس کے دل ہی میں رہ گئی۔

آخر جنگ یرموک شروع ہوئی۔ یہ بڑی خوفناک جنگ تھی۔ فوجیں ایک دوسرے پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑیں۔ خواتین پتھر اکٹھا کئے اور خیموں کی چوبیں اٹھائے تمام دن مستعد ٹیلے پر کھڑی رہیں لیکن کسی مسلمان نے جنگ سے منہ موڑنے کی کوشش نہ کی۔ پہلے دن کی جنگ میں خالد بن سعید کی بہادری

دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ رومیوں کے لشکر میں دور تک گھستے چلے گئے اور تمام دن ان کے درمیان کھڑے جنگ کرتے رہے۔ ان کے ساتھ کے دستوں نے دشمن کے لشکر کے درمیان ایک طوفان برپا کر دیا۔

رات ہوئی تو دونوں طرف سے جنگ بندی کر دی گئی۔ رومیوں کا سپہ سالار اباہان پہلے دن کی جنگ سے ایسا گھبرا گیا کہ اس نے صلح کی پیشکش کی۔ اس نے اپنے ایک سردار جارج باجرجہ کو سفیر بنا کر اسلامی لشکر میں بھیجا' وہ مسلمانوں کے جلال اور نظم وضبط سے ایسا متاثر ہوا کہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا اور مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو کر لڑنے کی اجازت مانگی۔ خالد بن سعید نے اسے بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر واپس بھیجا۔ اس دن صلح کی گفتگو تعطل کا شکار ہو گئی۔ دوسرے دن خالد بن سعید خود سفیر بن کر رومیوں کے لشکر میں گئے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

پھر یرموک کی فیصلہ کن جنگ شروع ہوئی۔ رومیوں کے لشکر کے آگے آگے مذہبی پیشوا انجیل مقدس ہاتھوں میں لئے عیسائیوں کے حوصلے بڑھا رہے تھے۔ مسلمانوں کے خطیب ابوسفیانؓ تھے۔ وہ لشکر کے اس سرے سے اس سرے تک گھوڑا دوڑا رہے تھے اور مسلمانوں کو جوش دلا رہے تھے۔ وہ ایک بار اپنے بیٹے یزید بن ابوسفیان کے قریب سے گزرے تو چیخ کے بولے:

''یزید۔ تو فوج کا ایک افسر ہے۔ ہمت اور پامردی سے لڑ اور کسی افسر سے پیچھے نہ رہ۔''

کئی ہزار رومیوں نے پیروں میں بیڑیاں پہن رکھی تھیں تا کہ میدان جنگ سے بھاگنے کا کیال ہی پیدا نہ ہو۔ اس کا جواب عکرمہ اور ان کے بیٹے عمرو بن عکرمہ

نے دیا۔

عکرمہ پورقوت سے چلا کر بولے:

''میں نے ہر میدان میں رسول اکرم کے ساتھ ساتھ جنگ کی ہے بھلا آج میں کیسے پیٹھ دکھا سکتا ہوں۔ میرے ہاتھ پر کون موت کی بیعت کرنے کے لئے تیار ہے؟''

عکرمہ کی آواز پر سب سے پہلے حارث بن ہشام اور ضرار بن ازور گھوڑے بڑھا کر ان کے پاس آئے پھر دیکھتے ہی دیکھتے چار سو مزید جانبازوں نے ان کے گرد حلقہ بنالیا۔ سب نے عہد کیا:

''موت کو گلے لگالیں گے لیکن میدان سے منہ نہ موڑیں گے۔''

ان جانبازوں کا حملہ بڑا طوفانی تھا۔

دوپہر کے وقت مسلمانوں کے کچھ دستوں میں ابتری پیدا ہوئی۔ ان پر رومیوں کا شدید دباؤ پڑ رہا تھا۔ پس انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ یہ دستے خالد بن سعید کے خیمے کی طرف پسپا ہو رہے تھے۔ وہاں خواتین اسلام تیار کھڑی تھیں۔ ابان کو جو شرجیل بن حسنہ کے دستے میں تھے انہوں نے رومیوں کو عورتوں کی طرف بڑھتے دیکھا تو وہ بنت عتبہ کی مدد کو چلے۔

ابان ابھی خواتین کے ٹیلے سے پرے ہی تھے کہ اوپر سے ان پر پتھر برسنا شروع ہو گئے۔ ابان نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔ وہاں بنت عتبہ سب سے آگے تھی اور سب سے زیادہ تیزی سے پسپا ہونے والے مسلمانوں پر پتھر برسا رہی تھی۔

ابان نے گھوڑا روک کر بنت کو آواز دی:

''ثمن۔ادھر دیکھو۔میں ہوں تمہارا ابان''

مگر جواب میں ثمن (بنت عتبہ) نے تاک کر ایک پتھر ابان کے سر پر مارا۔ابان نے جلدی سے ست گھمالیا مگر پتھر اس کے شانے کو زخمی کرتا ہوا آگے نکل گیا۔

ابان زور سے چیخا:

''ثمن۔ادھر دیکھو۔میں ہوں تمہارا ابان''

مگر جواب میں ثمن (بنت عتبہ) نے دوسرا پتھر اس پر برساتے ہوئے کہا:

''ابان واپس جاؤ......''مسلمان ہوتو واپس جاؤ......میرے شوہر ہوتو واپس جاؤ۔''

بنت عتبہ نے پھر نشانہ لے کر اسے پتھر مارا تھا۔اگر ابان پھرتے سے گھوڑا موڑ کر ہٹ نہ جاتا تو اس کا سر ضرور زخمی ہو جاتا۔

ابان سمجھا کہ میری بیوی پاگل ہوگئی ہے۔اس نے چیخ کے کہا:

''ثمن۔ہوش میں آؤ۔میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔رومیوں کا دباؤ اس طرف بڑھ گیا ہے۔خواتین کی حفاظت میرا فرض ہے۔''

اس وقت ایک پتھر ابان کے گھوڑے کے سر پر لگا۔گھوڑا بدکا۔ابان نے بڑی مشکل سے گھوڑے کو قابو میں کیا۔

پھر اوپر سے بنت عتبہ کی آواز سنائی دی:

''عورتیں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہیں۔تم بزدل ہو۔میدان چھوڑ کے آئے ہو۔واپس جاؤ ابان ورنہ میں پتھر مار مار کر تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کے سر پاش

پاش کر دوں گی۔ یہی میرے امیر لشکر کا حکم ہے۔"

ابان کی سمجھ میں نہ آیا کہ بنت عتبہ ایسی حرکت کیوں کر رہی ہے۔ اس نے گھوڑا سنبھال کر پوچھا:

"کیا امیر لشکر نے مسلمانوں کو پتھر مارنے کا حکم دیا ہے؟"

بنت عتبہ نے پھر پتھر مارتے ہوئے جواب دیا:

"تم مسلمان نہیں۔ بزدل بھگوڑے ہو۔ امیر کا حکم ہے کہ بھاگنے والوں کے سر پتھروں سے اور ٹانگیں خیمے کے چوبوں سے توڑ دی جائیں۔ واپس جاؤ ابان۔ ورنہ خدا کی قسم میں پتھر مار مار کر تمہارا قیمہ بنا دوں گی۔"

اب ابان کو ہوش آ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو واپسی کا شارہ کیا۔ اس کے کئی ساتھی پتھوں سے زخمی ہو گئے تھے۔ عورتیں..... اب بھی چیخ رہی تھیں۔

"ٹیلے پر سے واپس جاؤ واپس جاؤ......"

کے نعرے لگا رہی تھیں۔

ابان گھوڑا گھما کر پسپا ہوتے ہوئے دستوں کے پاس پہنچا اور چلا کر بولا۔

"رک جاؤ میرے ساتھیو۔ آج تمہارے قدم میدان میں نہ بڑھے تو کل مدینہ والوں کو کیا جواب دو گے۔ بڑھو بڑھو۔ آگے بڑھو اور دشمن کا منہ پھیر و۔"

یہ کہتا ہوا ابان شیر کی طرح گرجتا رومیوں پر جا پڑا۔ پسپا ہونے والوں کے قدم رک گئے اور انہوں نے سنبھل کر ایسا زبردست حملہ کیا کہ رومیوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

شام ہوتے ہی خالد بن سعید ابو عبیدہ بن جراح، عمرو بن العاص، شرجیل

بن حسنہ قعقاع بن عمرو مذعور بن عدی عکرمہ عمرو بن عمر اور یزید بن ابوسفیان نے رومیوں کے منہ پھیر دیئے۔ رومی سردار ابابان میدان جنگ میں مارا گیا۔ چالیس ہزار رومی گرفتار اور ایک لاکھ تیس ہزار رومی دریا میں غرق ہو گئے۔ خالد بن سعید گھوڑے سے اتر کر سربسجود ہو گئے۔

مسلمانوں کو فتح عظیم حاصل ہوئی تھی۔ جنگ یرموک میں ساڑھے تین ہزار مسلمانوں نے شہادت پائی جن میں عکرمہ اور ان کے بیٹے عمرو بن عکرمہ بھی تھے۔ ان دونوں نے خالد بن سعید کے زیر اثر جنگ کی اور ان کے زانو پر آخری ہچکی لی۔ جنگ یرموک میں ابوسفیان کی دوسری آنکھ بھی ضائع ہوگئی۔

رات کو جب ابان اور بنت عتبہ کی ملاقات ہوئی تو دونوں ہی اپنی اپنی جگہ شرمسار اور چپ چپ تھے۔ ابان نے پیار بھرے لہجے میں کہا:

''جان ابان۔ نظریں اٹھاؤ۔ میں تم سے شرمندہ ہوں۔''

بنت عتبہ نے آہستہ آہستہ دلہنوں کی طرح سر اٹھایا اور آنکھیں کھولیں۔ بندت عتبہ کی اس ادا پر ابان تڑپ اٹھا۔ اس نے بڑھ کر بنت عتبہ کے ہاتھوں پر محبت کے کتنے ہی پھول نچھاور کر دیئے۔

بنت عتبہ نے سمٹتے ہوئے کہا:

''ابان میں بھی تم سے شرمندہ ہوں۔''

''کیوں تم کیوں شرمندہ ہو۔ غلطی میری تھی۔ مجھے سزا مل گئی۔'' یہ کہتے ہوئے ابا نے اپنا وہ شانہ سہلانا شروع کیا جس پر بنت عتبہ کا پتھر لگا تھا۔

بنت عتبہ نے جلدی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

پھر پوچھا:

''زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟''

ابان شوخی سے بولا:

''یہ بات تو پھر مارنے سے پہلے سوچی ہوتی۔''

''وہ میرا فرض تھا ابان۔ میں مجبور تھی۔'' بنت عتبہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

ابان کو اسے چھیڑنے میں لطف آ رہا تھا۔ اس نے پوچھا:

''اگر میں پتھر کھا کر بھی تمہاری طرف بڑھتا رہتا تو تم کیا کرتیں؟''

''تو......تو میں......'' بنت عتبہ سنبھل کے بولی۔ ''تو میں اس قدر پتھر برساتی کہ تم اور تمہارا گھوڑا زمین پر لیٹ جاتے۔''

ابان نے اور چھیڑا...... ''اور اگر میں زخمی ہونے کے باوجود تمہارے پاس پہنچ جاتا تو؟''

بنت عتبہ نے اسی متانت سے کہا:

''اس وقت میں خیمے کی چوب سے تمہارا سر پھاڑ دیتی اور ٹانگیں توڑ دیتی۔''

''اگر میں نہ مرتا اور تمہاری طرف بڑھتا ہی رہتا تو۔''

ابان جیسے اسے لاجواب کرنا چاہتا تھا۔

بنت عتبہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولی:

''اگر تم پھر بھی باز نہ آتے تو میں خدائے واحد کی قسم اس وقت میں امیر لشکر کا حکم نظر انداز کرتے ہوئے اپنی کمان میں تیر جوڑتی اور وہ تیر تمہارے سینے پار

ہو جاتا۔"

"شاباش ثمن۔ تم صحیح معنوں میں شہید کی بیٹی ہو۔"

اور ابان نے وفورِ محبت سے گلے لگالیا۔

"مجھے تم پر فخر ہے۔ تم نے امیر لشکر کے حکم کو سمجھا اور اس پر عمل کیا۔ سپاہی کا پہلا فرض اپنے امیر کی اطاعت ہے۔"

"کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا؟" اب بنت عتبہ نے اسے چھیڑا۔

ابان ہنس کے بولا:

"اب تم مجھ سے بدلہ لے رہی ہو۔ تم نے امیر لشکر کی اطاعت کا اظہار کیا ہے۔ تم تو مبارک باد کے لائق ہو لیکن یہ تو بتاؤ کہ اگر میں تمہارے ہاتھ سے مارا جاتا تو تم کیا کرتیں؟"

بنت عتبہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی:

"خدا نہ کرے کہ ایسا ہوتا اور اگر خدا کو یہی منظور ہوتا تو یقین کرو ابان میں تمہاری لاش پر لات مار کر اپنے خیمے میں چلی جاتی۔"

"کیوں؟" ابان چونک کے بولا۔ "کیا تم میری بیوی نہیں ہو۔ بیوی کا فرض ہے کہ مرنے والے شوہر کا سوگ منائے۔"

بنت عتبہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا:

"ابان۔ ایک عرب عورت کے لئے اس سے بڑی اور کوئی بے عزتی نہیں کہ اسے ایک بزدل اور بھگوڑے کی بیوی کے نام سے پکارا جائے۔"

ابان کے دل میں بنت عتبہ کی عزت اور زیادہ ہوگئی۔

یہ دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ خالد بن سعید کا آدمی ابان کو بلانے آ گیا۔

ابان گھبرا گیا۔اس نے قاصد سے پوچھا:

''بھائی تمہیں کچھ پتہ ہے۔امیر محترم نے مجھے کیوں یاد کیا ہے؟''

''مجھے علم نہیں۔'' قاصد نے قطعی انکار کر دیا۔

''امیر اکیلے ہیں یا ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے''۔ابان نے دوسرا سوال کیا۔

قاصد نے بتایا۔

''تمام سردار اکھٹے بیٹھے ہیں۔''

ابان کی پریشانی بڑھ گئی۔وہ سمجھ گیا کہ اس نے خیموں کی طرف جانے کی جو غلطی کی ہے اس کا جواب طلب کیا جائے گا۔

بس ابان نے افسردگی سے کہا:

''میں نے امیر کی نافرمانی کی ہے تمن۔مجھ سے جواب طلب کیا جائے گا''۔

بنت عتبہ مسکرا کے بولی:

''ابان۔یہ بات تو پہلے ہی سوچنا چاہئے تھی''۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو.......''ابان نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔''تمہاری محبت نے مجھے اس وقت اندھا کر دیا تھا۔''

پھر اس نے پلٹ کے قاصد سے سوال کیا۔

''کیا میں اکیلا چلوں؟''

''نہیں۔امیر نے آپ کی بیوی کو بھی طلب کیا ہے۔''

''مجھے؟''اور بنت عتبہ کا رنگ فق ہو گیا۔

ابان کو موقعہ مل گیا۔اس نے فوراً کہا:

''اب تک تو خوب بول رہی تھیں۔اب چلو میرے ساتھ۔خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔''

خالد بند سعید تمام جلیل القدر سرداروں کے ساتھ ایک میدان میں بیٹھے تھے۔وہاں نہ فرش وفروش تھا اور نہ قالین اور گاؤ تکئے۔تمام لوگ آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔اوپر آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔

دونوں میاں بیوی ڈرتے ڈرتے ان کے سامنے پہنچے۔دونوں نے حاضرین کو سلام کیا۔

ابان کے بولنے سے پہلے شرجیل بن حسنٰی نے کہا۔

''ابان کی میں نے بہت تعریف سنی ہے اسی جوان نے جنگ اجنادین میں رومی سردار قیقلان کا سر اتارا تھا۔''

''تعجب کی بھات ہے۔''خالد بن سعید بولے۔''ایسا بہادر سردار ایسی سخت غلطی کرے۔کیوں ابان تم اپنی جگہ چھوڑ کے خیموں کی طرف کیوں گئے تھے؟''

اس دفعہ ابان کے بجائے بنت عتبہ نے جواب دیا:

''امیر محترم۔یہ غلطی ابان نے میری وجہ سے کی ہے۔انہوں نے رومیوں کو خیمے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو ان کے دل میں محبت نے جوش مارا اور وہ مجھے بچانے کے لئے میدان چھوڑ کے پیچھے آ گئے۔اے امیر۔یہ ابان کی سخت غلطی

ہے۔ان کے دل میں لشکر اسلام کی محبت کی بجائے صرف اپنی بیوی کی محبت پیدا ہوئی۔ میں بنت عتبہ ان کی بیوی ہوں مگر میں ان کی سفارش نہ کروں گی۔ ابان کو سزا ملنی چاہئے۔''

خالد بن سعید نے مسکرا کے کہا:

''بنت عتبہ۔تم ان کی سفارش نہ کروتب بھی ہم انہیں سزا نہیں دے سکتے۔تم سے پہلے ہی ان کی دو سفارشیں ہمارے پاس پہنچ چکی ہیں۔''

''تو کیا آپ معاف کر دیں گے امیر محترم''بنت عتبہ نے غم اور خوشی یک ملے جلے لہجے میں پوچھا۔

خالد بن سعید نے بنت عتبہ کو کوئی جواب نہ دیا۔انہوں نے ابان سے پوچھا:

''ابان۔تمہاری بیوی نے تمہیں کتنے پتھر مارے تھے اور ان پتھروں سے کیا تمہیں چوٹ آئی تھی؟''

ابان کی شرم کی وجہ سے گردن نہ اٹھتی تھی۔اس نے کہا:

''امیر محترم۔مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر اوپر سے لاتعداد پتھروں کی بارش ہو رہی تھی لیکن اے امیر یہ میری غلطی تھی۔ میں اپنی غلطی کے لئے سخت شرمندہ ہوں اور ہر سزا کے لئے تیار ہوں۔''

خالد بن سعید نے کہا:

''اے بنت عتبہ۔کیا تم نہیں جانتیں کہ''اعتراف جرم''جرم کی شدت کو کم نہیں کرتا ہے پھر ابان کی یہ سزا کیا کم ہے کہ تم نے خود اسے مار مار کے زخمی کر دیا ہے۔تمہارا اپنے شوہر کو خلوص نیت سے پتھر مارنا ابان کے لئے سفارش بن گیا۔

اس کے بعد ابان نے دوسری سفارش کی تھی۔ ان حالات میں جبکہ مجرم کو اپنے جرم سے زیادہ سزا مل چکی ہو اور اس نے خود اس کی تلافی کرنے کی سفارش کرنے کی کوشش کی ہو پھر ہم کیسے سزا دے سکتے ہیں؟''

ابان عتبہ نے دیکھا کہ تمام چہروں پر غصے کی سختی کے بجائے لطف و عنائت کی نرمی ہے۔

بنت عتبہ نے نرمی سے کہا:

''امیر محترم۔ میں آپ کی شکر گذار ہوں کہ آپ نے میرے شوہر کو معاف کر دیا'' پھر وہ ابان کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی:

''اگر چہ ابان کا جرم معافی کے قابل نہ تھا۔''

اس پر خالد بن سعید نے ابان کو نصیحت کی:

''ابان۔ یاد رکھو ایک سپاہی اور ایک پیادے کا اپنی صف سے نکلنا اور جگہ چھوڑنا' صف بندی کی پوری ترتیب کو درہم برہم کر دینا ہوتا ہے۔ جب بھی کسی فوجی دستے نے امیر لشکر کے حکم کے بغیر اپنی جگہ چھوڑی اسے اور اس کے لشکر کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اب تم جاؤ اور آئندہ اس کا خیال رکھنا''

ابان واپس ہونے لگا تو خالد بن سعید نے سمجھایا:

''ابان اپنی بیوی کو ساتھ لے جاؤ۔ ہم نے اس نیک بوبی کو اس وجہ سے بلوایا تھا کہ تمہارے دل میں اس کی طرف سے میل آ گیا ہو تو اسے دور کرا دیں۔ تمہیں ایسی اصول پرست اور بہادر بیوی کی قدر کرنی چاہئے۔''

ابان اور بنت عتبہ خیمے کی طرف واپس ہوئے تو ابان نے اسے چھیڑا:

''بڑی ظالم ہو تم۔ مجھے سزا دلوانے کی تو تم نے پوری کوشش کی تھی''۔

''امیر نے مجھے اصول پرست کہا ہے نا۔'' بنت عتبہ نے جواب میں کہا۔

''میں نے تو صرف اصلو کی بات کہی تھی۔ چاہے اس سے تمہیں سزا ملتی یا معاف کر دیئے جاتے''۔

ابان نے جواب دیا:

''اگر میں یہ کہہ دیتا کہ میری بیوی بہت دیکھ بھال کے اس طرح مجھے پتھر مار رہی تھی کہ مجھے کوئی پتھر نہ لگ سکے اور دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہو کر میری خوب پٹائی ہو رہی ہے۔ تو پھر تمہارا کیا حشر ہوتا؟

بنت عتبہ نے چڑ کے کہا۔

''ابان اگر تم امیر کے سامنے یہ بات کرتے تو میں سمجھتی کہ میرا شوہر صرف بز دل ہی نہیں جھوٹا بھی ہے۔''

اس جگہ یہ نقطہ یاد رکھنے کے قابل ہے کے بعض مورخین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ محاصرہ دمشق کے بعد محاصرہ یرموک پیش آیا تھا مگر زیادہ اتفاق اس بات پر ہے کہ محاصرہ دمشق میں واقعہ دمشق سے پہلے ایک خوفناک جنگ ہوئی تھی جس نے سلطنت روما کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں اور یہ محاصرہ یرموک تھا۔

اسلامی لشکر ابھی وادی یرموک میں ٹھہرا ہوا آئندہ قدم اٹھانے کے بارے میں صلاح ومشورے میں مصروف تھا کہ ایک شام مدینہ منورہ سے ایک قاصد ی وادی میں داخل ہوا اور اس نے امیر لشکر کا خیمہ دریافت کیا۔ اس وقت تک خالد بن سعید امیر لشکر تھے۔ تمام سرداروں نے فیصلہ کیا تھا کہ جب تک خالد بن سعید

ملک شام میں ہیں وہی امیر لشکر رہیں گے۔ پس قاصد کو خالد بن سعید کے خیمہ پر پہنچایا گیا۔

خالد اس وقت خیمہ میں تنہا تھے۔ قاصد نے انہیں سلام کر کے ایک خط ان کی طرف بڑھا دیا۔

جناب خالد خط کھول رہے تھے کہ قاصد نے کہا:

''اے امیر لشکر۔ میں بہت افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دیتا ہوں خلیفتہ المسلمین جناب ابو بکر صدیقؓ نے انتقال فرمایا اور حضرت عمر فاروقؓ ان کے جانشیں مقرر ہوئے ہیں۔''

حضرت خالد بن سعید اس افسوسناک خبر سے بہت افسردہ ہوئے۔ کچھ دیر وہ افسردگی کے عالم میں خاموش بیٹھے رہے پھر خط پڑھا۔ یہ خط حضرت عمر فاروقؓ کی طرف سے تھا۔ اس میں درج تھا۔

''اے امیر لشکر میں بہت افسوس کے ساتھ آپ کو حضرت ابوبکر صدیق کی وفات کی اطلاع دیتا ہوں مزید یہ کہ خلیفہ اول نے انتقال فرمایا اور حضرت عمر فاروق کو ان کا جانشیں مقرر کیا گیا ہے۔''

حاضرین مجلس نے خلیفہ اول کے انتقال پر افسوس کیا اور ان کی جگہ حضرت عمر فاروقؓ کو بحیثیت خلفیہ دوم کی نامزدگی پسند کی۔ اس خط کے ذریعہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو پورے لشکر اسلام کا سپہ سالار بھی بنایا گیا تھا۔ حضرت خالد بن سعید اس وقت مستعفی ہو گئے۔ انہوں نے اس بات کا کوئی گلہ شکوہ نہ کیا۔

لشکر اسلام میں حضرت ابوبکر صدیق کی وفات کی خبر سے افسردگی پھیل گئی

اور ہر آنکھ پرنم ہوگئی۔ حالات کی سنگینی کے پیش نظر حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے حضرت عمر فاروقؓ کو فتح یرموک کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ فتح یرموک کی خبر پہلے ہی مدینہ پہنچ چکی تھی۔ حضرت ابوعبیدہ نے اپنے خط میں خلیفہ دوم کو یہ بھی لکھا کہ......

''یرموک میں رومی لشکر تقریباً تمام کا تمام ختم ہوگیا ہے مگر چالیس پچاس ہزار رومی بچ کر بھاگ نکلے ہیں۔ دوسری اطلاع یہ ہے کہ قیصر روم نے 'یرموک' کی شکست کا حال سن کر ایک عظیم لشکر شام کے دارالسلطنت دمشق کی طرف روانہ کیا ہے''۔

حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو حکم دیا کہ ایک مضبوط دستہ ''فحل'' کی طرف روانہ کیا جائے جو شکست خوردہ رومیوں کو الجھائے رکھے۔ باقی لشکر دمشق پہنچ جائے جو رومیوں کی آخری پناہ گاہ ہے۔

حضرت ابوعبیدہ نے اس حکم کے تحت ایک دستہ فوج فوراً ''فحل'' کی طرف روانہ کر دیا۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ دمشق کے رومی لشکر کو ''حمص اور فلسطین'' دونوں جانب سے برابر کمک پہنچ رہی ہے۔ حضرت ابوعبیدہ نے فوراً دو دستے حمص اور فلسطین کے راستوں پر لگوا دیئے تا کہ دمشق کو کمک نہ پہنچ سکے۔ اس انتظام کے بعد وہ شام کے صدر مقام کی طرف روانہ ہوئے۔

دمشق میں رومی لشکر کا سپہ سالار ''نسطار بن نسطورس'' تھا۔ فیصل شہر کے چاروں طرف چار دروازے تھے۔ فیصل کے چاروں طرف ایک گہری اور چوڑی خندق بھی تھی جو پانی سے ہر وقت لبالب بھری رہتی تھی۔ ایک دروازے سے دوسرے دروازے کا فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ اگر ایک دروازے پر جنگ شروع ہو

جائے تو اس کی اطلاع دوسرے دروازے تک پہنچنے میں کئی گھنٹے لگ جاتے تھے۔ شہر دمشق کے مشہور دروازے نمبر 1 باب جابیہ نمبر 2 باب المشرق نمبر 3 باب توما زیادہ مشہور تھے۔ باب توما کی حفاظت ہرقل اعظم کے داماد کے سپرد تھی۔ اس کا نام توما تھا جس نام سے یہ دروازہ موسوم تھا۔

ہرقل اعظم کو لشکر اسلام کے دمشق کی طرف بڑھنے کی اطلاع پہنچی تو اس نے فوراً "حمص" سے تازہ دم لشکر روانہ کیا۔ ایک اور لشکر فلسطین سے بھی بھیجا گیا۔ دور اندیش لشکر اسلام نے اس کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا۔ پس مدد کو آنے والے لشکروں کو راستے ہی میں روک لیا گیا اور انہیں لڑائی میں ایسا الجھایا کہ وہ دمشق جانے کا راستہ ہی بھول گئے۔

مسلمانوں کے حملے کی خبر پا کر نسطار بن نسطورس قلعہ بند ہو کے بیٹھ گیا تھا۔ حضرت عبیدہ نے دمشق پہنچتے ہی دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ باب مشرق پر خالد بن سعید مغرب میں خود ابوعبیدہ بن جراح شمال میں عمرو بن عاص اور جنوب میں باب توما پر شرجیل بن حسنی کو سردار مقرر کیا گیا تھا۔

ابان اب تک شرجیل بن حسنہ کے دستوں میں شامل تھا۔ یزید بن ابوسفیان کو محفوظ لشکر دیا گیا تھا کہ وہ بوقت ضرورت دوسرے دستوں کو کمک پہنچاتے رہیں

۔

رومیوں کو کھلے میدان میں آنے کی جرات نہ ہوئی۔ انہوں نے مدافعتی جنگ کا طریقہ اختیار کیا۔ مسلمانوں کے لئے دریا جیسی گہری خندق عبور کرنا آسان نہ تھا۔ وہ روز فصیل پر حملہ کرتے مگر اوپر سے تیروں کی ایسی سخت بارش ہوتی

کہ مسلمانوں کا کوئی بس نہ چلتا۔ شمشیرزنوں کی شمشیریں بیکار ہو رہی تھیں اور لڑائی صرف تیر اندازی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر دروازے پر صبح سے شام تک دونوں طرف سے تیر اندازی ہوتی رومی چونکہ فیصل کے اوپر تھے اس لئے ان کا کم نقصان ہوتا۔ مسلمان کھلے میدان میں ہونے کی وجہ سے انہیں زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتے۔

اسلامی لشکر اس صورت حال سے پریشان تھا۔ پھر مسلمانوں نے مشکوں کے ذریعہ خندق پار کرنے کی کوشش کی۔ اس میں انہیں کامیابی بھی ہوئی لیکن خندق کے اس پار پہنچنے کے باوجود وہ فیصل تک نہ پہنچ سکے۔ اگر فیصل کے کسی دروازے پر لشکر اسلام کے چند سپاہی مشکوں کے ذریعہ خندق پار کر لیتے تو انہیں وہاں سامنے سے آنے والے سینکڑوں تیروں کا سامنا کرنا پڑتا اور آگے نہ بڑھ پاتے۔

محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ دس پندرہ دن پھر ایک مہینہ' یہاں تک کہ پورے دو ماہ گزر گئے مگر مسلمانوں کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

بنت عتبہ کا شوہر ابان ایک سو سواروں کا رسالدار تھا۔ ایک شب اس نے اپنے سواروں کو اکٹھا کیا اور بڑی سنجیدگی سے کہا:

''تم میں کون ایسا مجاہد ہے جو میرے ہاتھ پر موت کی بیعت کرے گا۔''

موت کی بیعت کسی بہت ہی اہم موقعہ پر کی جاتی تھی۔ یہ دراصل شہادت کی ایک قسم تھی۔ قسم کھانے والے یہ سوچ لیتے تھے کہ جس کام کے لئے وہ جا رہے ہیں اس کام میں وہ اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ ابان کے سواروں کے معلوم تھا کہ

ابان بن سعید کی شادی نئی نئی ہوئی ہے اور ابھی اس جوان نے جوانی کی کوئی بہار نہیں دیکھی۔ مگر؟ انہوں نے یہ آواز سنی تو انہیں بہت غیرت آئی اور ایک ایک کر کے ابان کے تمام سواروں نے موت کی بیعت کر لی۔

اس وقت ابان مسرور لہجے میں بولا:

''میرے ساتھیو۔ مجھے آسمان پر جنت کے دروازے کھلے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہم سے پہلے شہید ہونے والے ہمیں بلا رہے ہیں۔ کل صبح ہم خندق ایک ساتھ پار کریں گے اور دمشق کی فصیل پر یا تو چڑھ جائیں گے یا پھر اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔''

ابان کے ساتھی شہادت کی قسم کھا چکے تھے۔ انہوں نے ابان کو اور حوصلہ دیا۔ صبح کو جب میدان کارزار گرم ہوا تو ابان اپنے تمام ساتھیوں کے ہمراہ خندق میں اترا۔ خواتین کا خیمہ اونچی جگہ نصب تھا۔ بنت عتبہ نے اپنے شوہر کو خندق میں اترتے دیکھا تو اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ بنت عتبہ' خواتین میں بہت مقبول تھی۔ خواتین اس کے شوہر کو بھی پہچانتی تھیں۔ ان سب نے بنت عتبہ کو مبارکباد دی۔

ابان کو خندق پار کرتے دیکھ کر اور کئی سو آدمی خندق میں اتر گئے۔ باب توما کا سردار توما' قلعہ کے اوپر کھڑا ہوا مسلمانوں کی اس جرات کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ توما کے قریب ہی دمشق کا ایک پادری صلیب اٹھائے کھڑا تھا۔ اسے بھی مسلمانوں کی اس جرات پر بڑی حیرت ہوئی۔

ادھر ابان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس پار پہنچا تو فصیل سے تیروں کی بارش

شروع ہوگئی۔ابان اوراس کے ساتھوں نے ڈھالوکوتلوار کے سہارے زمین میں گاڑ دیااوران کی آڑ میں لیٹ کراورکہیں بیٹھ کے تیر اندازی شروع کی۔اب تک فصیل والوں کونقصان نہیں پہنچا تھا لیکن ابان کی اس حکمت عملی سے فصیل والے مسلمانوں کی زد میں آ گئے اور مسلمانوں کے تیروں نے انہیں زخمی کرنا شروع کر دیا۔

شرجیل بن حسنہ اور یزید بن ابوسفیان خندق کے اس کھڑے بہادر ابان اور اس کے ساتھیوں کی محفوظ تیر اندازی دیکھ رہے تھے۔شرجیل بن حسنہ کے دماغ میں فوراً یہ خیال گزرا کہ اگر پورا لشکر اس طرح خندق پا کر آئے تو فصیل تک ضرور پہنچا جا سکتا ہے مگر مشکل یہ تھی کہ پورے لشکر کو پار اتارنے کے لئے ان کے پاس اتنے مشکیزے موجود نہ تھے۔انہوں نے فوراً یزید بن ابوسفیان سے مشورہ کیا اور طے پایا کہ سپہ سالار سے اتنی تعداد میں مشکیزے مہیا کرنے کی درخواست کی تا کہ پورا لشکر ایک ساتھ خندق عبور کر کے فیصل پر حملہ کر سکے۔

دو گھنٹے کی مسلسل تیر اندازی نے رومیوں کو کافی نقصان پہنچایا۔رومی اب رک رک کر اور آڑ میں کھڑے ہو کر تیر پھینکنے پر مجبور تھے۔اس دوان ابان کے سامنے تلوار کی ٹیک سے کھڑی ڈھال اتفاقاً گر پڑی اور فصیل سے آتا ہوا ایک تیر ابان کی ران میں پیوست ہوگیا۔بہادر ابان نے چھبا ہوا تیر ران سے کھینچ کر دور پھینک دیا اور زخم پر عمامہ کی چٹ کی ایک پٹی کس کے باندھ دی۔اسی وقت شرجیل بن حسنہ نے ابان اور دوسرے لوگوں کو واپس آنے کا حکم دیا۔کیونکہ صرف چند سو تیر اندازوں سے فصیل والوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ابان اور اس

کے ساتھی موت کی بیعت کر چکے تھے لیکن سالار کے حکم پر انہیں واپس آنا پڑا۔

ابان جب واپس آیا تو شرجیل بن حسنہ نے اسے شاباش دیتے ہوئے کہا:

''ابان........ میں تمہاری بہادری سے بہت خوش ہوں۔ تم اور تمہارے ساتھی اگر چہ قلعہ والوں کو زیادہ نقصان نہ پہنچا سکے لیکن ہمیں اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ اگر تم لشکر ایک ساتھ خندق پار کر جائے تو فصیل تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں۔''

ابان خاموشی سے امیر کی باتیں سنتے رہے۔ وہ کیسے کہتے کہ ان کے دل میں تو شہادت کی آرزو تھی جو پوری نہ ہو سکی۔ ابان نے خود کو اب تک سنبھالے رکھا تھا۔ وہ خود چل کے شرجیل بن حسنہ کے پاس پہنچے تھے اور اپنے پیر کی تکلیف کو چھپائے رکھا تھا۔ لیکن جب وہ واپس جانے لگے تو ان کے پیر لڑکھڑا گئے۔ شرجیل بن حسنہ نے فوراً بڑھ انہیں سہارا دیا۔ پھر ان کی نظر ابان کی ران پر بندھے ہوئے عمامے پر پڑی۔ شرجیل بن حسنہ نے دریافت کیا:

''ابان! عمامہ ان پر کیوں باندھا ہے کیا کوئی زخم آ رہے ہے؟''

ابان صرف ''ہاں'' کہہ سکے۔ پھر ان کی زبان بھی لڑکھڑا گئی اور پھر وہ شرجیل کے ہاتھوں میں ہی بے ہوش ہے گئے۔ شرجیل بن حسنہ نے ابان کو فوراً اس کے خیمے میں بھجوا دیا۔

بنت عتبہ خیمے میں خوش بیٹھی تھی اور اپنے بہادر شوہر کا انتظار کر رہی تھی لیکن جب دو آدمی ابان کو ہاتھوں پر اٹھائے خیمے میں لائے تو وہ گھبرا گئی۔ ابان کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر نیلاہٹ پھیلی تھی۔ اسی وقت مرہم پٹی کرنے والے

آ گئے۔انہوں نے عمامہ کھول کر ابان کی ران کا زخم دیکھا۔زخم کے چاروں طرف حصہ نیلا پڑ گیا تھا۔

ایک دانا طبیب نے تبصرہ کیا۔

''یہ زخم زہر بھرے تیر کا ہے۔''

دوسرے طبیب نے سر جھک کر زخم دیکھا اور اپنے ساتھی کی رائے کی تصدیق کی۔

بنت عتبہ بھاگ کر ابان کے پاس پہنچی۔اس نے ابان کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیا۔

ایک طبیب نے جا کر سالار کو بتایا:

''ابان کو زہر بھرے تیر کا زخم لگا ہے۔زہر تمام جسم میں پھیل چکا ہے۔''شر جیل بن حسنہ اور یزید بن ابو سفیان دونوں ہی ابان کو دیکھنے خیمے میں آ گئے۔ابان کا سارا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں اور ہونٹوں پر کپکپاہٹ تھی۔

شر جیل بن حسنہ نے اپنا کان ابان کے ہونٹوں سے لگایا:

شر جیل بن نے اپنا سر الگ کرتے ہوئے بنت عتبہ سے کہا:

''ابان تمہیں آواز دے رہے ہیں''

بنت عتبہ ابان پر جھک گئی اور بولی:

''ابان۔آنکھیں کھولو۔میں تمہارے پاس ہوں۔تمہارا سر میرے زانو پر ہے۔''

ابان نے شاید زور لگایا۔اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلیں۔اس نے کہا:

''میری آرزو پوری ہوگئی۔میں عتبہ کے پاس جا رہا ہوں''۔

ابان نے یہ لرزتے ہونٹوں سے کہا پھر اس کی آواز بند ہو گئی۔اسے ایک ہچکی سی آئی اور آنکھیں بند ہو گئیں اور بیچاری بنت عتبہ کے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکلی۔پھر وہ خالی خالی آنکھوں سے شرجیل بن حسنہ کو دیکھنے لگی۔

شرجیل بن حسنہ نے گلوگیر آواز میں کہا:

''بنت عتبہ! ابان نے موت کی بیعت کی تھی۔اللہ تعالیٰ نے اس کی شہادت قبول فرمائی۔تمہیں غم نہیں کرنا چاہیے۔''

بنت عتبہ نے آہستہ سے ابان کا سر اپنے زانو سے ہٹا کر فرش خاک پر رکھ دیا اور لاش سے یوں گویا ہوئی:

''ابان! جس خدا کے حکم سے ہم اکٹھا ہوئے تھے اس کے حکم سے ہم آج جدا ہو گئے۔ مجھے اس جدائی کا غم نہیں۔اللہ تعالیٰ نے تمہیں شہادت کا مرتبہ عطا کیا ہے۔تم اب میرے باپ کے ساتھ ہو لیکن میں تم سے زیادہ دنوں تک جدا نہ رہ سکوں گی۔میں خدا کے حضور قسم کھاتی ہوں کہ میں رومیوں کے خلاف جہاد کروں گی اور اس وقت تک جہاد کرتی رہوں گی جب تک تمہارے پاس نہیں آتی۔مجھے امید ہے کہ میرا خدا میری آرزو ضرور پوری کرے گا۔''

خیمے کے اندر موجود تمام لوگ بنت عتبہ کے عہد اور باتوں پر رو دیئے۔سب کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ان کی آنکھوں کے سوتے جیسے خشک ہو گئے تھے۔

ذرا دیر بعد بنت عتبہ نے سالار لشکر سے کہا:

''سالار محترم! میں اپنا عہد نبھانا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے جہاد کی اجازت دیجئے۔''

اس وقت تک خواتین کو براہ راست جہاد کی اجازت نہ تھی۔ ان کے سپرد فوجیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال تھی۔ چنانچہ شرجیل بن حسنہ نے یزید بن ابو سفیان کی طرف دیکھا۔

یزید بن ابو سفیان نے بنت عتبہ کو سمجھایا:

''میری نیک بیٹی! لشکر اسلام میں کسی طور سے بھی شرکت کرنا جہاد میں داخل ہے پس اس جہاد میں تم پہلے ہی شریک ہو۔''

''نہیں سپہ سالار......'' بنت عتبہ نے ضد کی۔ ''مرحوم سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کرنے میں آپ میری مدد کیجئے۔ میں ایک اچھی تیر انداز ہوں۔ مجھے تیر انداز دستوں میں شامل کر لیجئے۔''

شرجیل بن حسنہ نے بنت عتبہ کے غم کو ہلکا کرنے کے لئے اور اس خیال سے تیر انداز دست بدست لڑائی سے ذرا دور ہی رہتے ہیں۔ بنت عتبہ کو جہاد کی اجازت دیدی اور اسے تیر اندازوں میں شامل کر لیا۔

اس اجازت سے تو بنت عتبہ کو جیسے اپنے زخموں کا مرہم مل گیا۔ ابان کی نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ انہیں دفن کیا گیا لیکن شہید عتبہ کی بیٹی اور شہید ابان بن سعید بن عاص کی بیوہ نے اپنی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکنے دیا۔ اس نے صبر و شکر کا ایسا مظاہرہ کیا کہ لشکر میں موجود تمام خواتین نے اس کی عظمت اور بردباری کی تعریف کی۔

بنت عتبہ پر وہ رات بہت بھاری گزری۔اس کے باپ کا غم ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ محبوب کے غم نے اسے تازہ صدمہ پہنچایا۔شرجیل بن حسنہ نے حکم سے چار خواتین عتبہ کے خیمے میں آ گئیں۔تا کہ اسے تنہائی کا احساس نہ ہو۔ان خواتین نے بنت عتبہ کا غم بھلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ سینے پر پتھر رکھے تمام رات اپنے ترکش اور تیروں کی نوکیں درست کرتی رہی۔اسے آج صبح ہونے کا بہت انتظار تھا۔

صبح ہوتے ہی بنت عتبہ نے ڈھیلے دھالے کپڑوں پر چادر کسی۔سر پر رومال لپیٹ کر چہرے پر ڈھاٹا باندھا اور تیر کمان سنبھال کر تیر اندازوں کی صفوں میں شامل ہوگئی۔دھوپ نکلتے ہی حسب معمول دونوں طرف کے تیر اندازوں نے اپنے جوہر دکھانے شروع کیے۔بنت عتبہ کو رات ہی میں معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے پیارے شوہر کا قاتل باپ توما کا سپہ سالار توما ہے اس کے زہریلے تیر کے زخم سے ابان کا انتقال ہوا ہے۔

خندق کے کنارے تیر اندازوں نے مورچے بنا رکھے تھے۔مورچہ میں پہنچ کے بنت عتبہ نے ایک تیر انداز سے توما کے بارے میں پوچھا۔تیر انداز دیر تک فصیل پر نظریں دوڑاتا رہا پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا:

''وہ دیکھو بہن!فصیل پر چھوٹے برج کے قریب ایک جگہ صرف دو سر قریب قریب نظر آرہے ہیں۔''

بنت عتبہ نے پوچھا۔

''وہ دو آدمی جس میں ایک کے ہاتھ میں جھنڈا ہے۔''

''ہاں بہن وہی۔'' تیر انداز نے جواب دیا۔ ''مگر وہ جھنڈ دراصل رومیوں کی ''صلیب مقدس'' ہے۔ صلیب کو ایک پادری لئے کھڑا ہے۔ اس کے برابر والا آدمی دراصل سردار ''توما'' ہے۔ رومیوں کو یہ یقین ہے کہ جب تک فصیل پر ''صلیب مقدس'' لہراتی رہے گی، مسلمان قلعہ کو فتح نہیں کر سکیں گے''۔

تیر انداز کے یہ الفاظ بنت عتبہ کے کانوں سے ہوتے ہوئے دل میں اتر گئے۔ اس کے دل سے شوہر کے قاتل سے انتقال لینے کا خیال اک دم نکل گیا۔ قصاص کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کی نظریں فصیل پر لہراتی صلیب پر جم کر رہ گئیں۔

بنت عتبہ سب کی نظریں بچا کر مورچے کے اوپر چڑھ گئی۔ اس وقت فصیل سے اسلامی مورشوں پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی لیکن بنت عتبہ مورچے پر کھڑی اپنے قدم جما رہی تھی۔ تیر اندازوں نے اسے دیکھا تو چیخ چیخ کر اسے نیچے بلایا۔ بنت عتبہ نے ہر آواز سے کان بند کر لئے تھے۔ اس نے کمان سنبھالی۔ ترکش سے تیر نکال۔ کمان میں چڑھایا پھر بسم اللہ کہہ کر چلہ کھینچا۔ تیر ایک ''زوں'' کی آواز کے ساتھ کمان سے نکلا۔ موت اس تیر کے پیچھے پیچھے بھاگی۔ فصیل پر پہنچ کے بنت عتبہ کا تیر موت کا پیغام بن گیا اور سیدھا پیوست ہو گیا۔ پادری ایک چیخ مار کر فصیل پر گرا اور اس کے ہاتھوں میں لہراتی ہوئی صلیب اعظم، چھوٹ کے لہراتی ہوئی فصیل کے نیچے جا گری۔

صلیب مقدس کا قلعہ کے باہر گرتے دیکھ کر دو پر جوش جوانوں نے خندق میں چھلانگیں لگا دیں۔ وہ تیرتے ہوئے پہنچے اور تیزی سے فصیل کی طرف بھاگے۔

رومیوں نے صلیب اعظم کو مسلمانوں سے بچانے کے لئے سینکڑوں تیر برسا دیئے۔ ایک مجاہد نے اس کوشش میں جان دیدی اور وہ تیر کا لقمہ بن گیا مگر دوسرا مجاہد اپنی کوشش میں کامیاب ہوا اور فصیل کے پاس سے صلیب اٹھا کر لشکر اسلام میں واپس آ گیا۔ اب رومیوں نے جھلا کر اور زیادہ تیروں کی بارش کر دی۔

صلیب اعظم کو شرجیل بن حسنہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ صلیب دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر جب انہیں بتایا گیا کہ صلیب بردار پادری کو ابان شہید کی بیوی نے اپنے تیر کا نشانہ بنایا تھا تو وہ اور زیادہ خوش ہوئے انہوں نے بنت عتبہ کو بلا کر اسے بہت شاباش دی۔

فصیل کے اوپر ہرقل اعظم کا داماد ''توما'' بلبلا یا بلبلایا پھر رہا تھا۔ صلیب اعظم کا مسلمانوں کے ہاتھوں میں پہنچنا اور ایک مقدس راہب کا مارا جانا اس کے لئے شرم کا مقام تھا۔ یہ اس کے مذہب کی بھی توہین تھی۔ صلیب کے گر جانے سے رومیوں میں بد دلی پیدا ہو گئی تھی۔ رومی سپہ سالار توما کو اور کچھ نہ سوجھا تو اس نے کھلے میدان میں مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے حکم دیا کہ باب توما کھول کے مسلمانوں پر حملہ کیا جائے اور ان سے ''صلیب اعظم'' واپس چھینی جائے۔ توما کے اس اعلان سے رومیوں میں بہت جوش وخروش پیدا ہو گیا۔ اور آخر وہ صلیب کی بے حرمتی کا بدلہ لینے کے لئے قلعہ کا دروازہ کھول کے باہر نکل آئے۔

مسلمان تو اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے رومیوں کو قلعہ سے نکلتے دیکھا تو وہ جان بوجھ کر خود ہی کچھ اور پیچھے ہٹ گئے تا کہ تمام رومی میدان میں آ جائیں رومی لشکر بڑے زور شور سے باہر نکلنے لگا۔ آگے آگے سوار اور کے پیچھے اپنے

مخصوص ٹھکانوں پر پہنچ گئے۔ رومی تیر برساتے آگے آرہے تھے۔ مسلمان تیر اندازوں نے تیر کا جواب تیر سے دیا۔

رومی سپہ سالار توما تھا۔ بنت عتبہ کو توما کی تلاش تھی۔ انتقام کی چنگاری اس کے دل میں پھر بھڑ اٹھی۔ توما بنت عتبہ کے پیارے شوہر کا قاتل اس کی نظروں کے سامنے تھا اور وہ میدان میں گھوڑا بھگا بھگا کر مسلمانوں پر زبردست حملے کر رہا تھا۔ اس کا گھوڑا میدان میں بجلی کی طرح لپک رہا تھا۔

دونوں لشکر آپس میں گتھ گئے تھے۔ تیر نکالنے اور چلانے کا وقت گزر چکا تھا۔ نیزے اور تلواریں ہر طرف چمک اٹھی تھیں۔ مسلمان جم کر لڑ رہے تھے لیکن رومیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ قلعہ سے سوار اور پیادے نکل نکل کر ان میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔ شرجیل بن حسنہ بڑھ بڑھ کے حملے کر رہے تھے اور لوگوں کو جوش دلاتے جا رہے تھے لیکن اب دشمن کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی تھی کہ اسے پیچھے دھکیلنا مشکل تھا۔

اس طرح دوپہر تک سخت جنگ ہوتی رہی۔ مسلمان اپنی تمام تر کوشش کے باجود رومیوں کو پیچھے نہ ہٹا سکے۔ یہ صورت حال نہایت پریشان کن تھی۔ معاً بنت عتبہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ ترش کاندھے پر ڈالا اور کمان سنبھالتی وہ آگے بڑھی اور بڑھتے بڑھتے اس جگہ پہنچ گئی جس جگہ رومی سپہ سالار توما خود جنگ کر رہا تھا اور ساتھ ہی اپنے ساتھیوں کے حوصلے بھی بلند کر رہا تھا۔

بنت عتبہ ایک اونچی جگہ کھڑی ہوگئی۔ رومی سالار فولاد کے زرہ بکتر میں غرق تھا۔ سر پر آہنی خود۔ گلے کے گرد آہنی زنجیریں۔ باقی تمام جسم بھی فولاد کی چادر میں

لپٹا ہوا تھا۔ بنت عتبہ کو صرف اس کی آنکھوں کے دائرے نظر آ رہے تھے جن میں کسی کسی وقت چمکتی ہوئی پتلیاں بھی نظر آ جاتی تھیں۔ اس صورت حال پر توما پر تیر چلانا بڑا مشکل تھا۔ تیر خطا ہو کر کسی مسلمان کو بھی زخمی کر سکتا تھا۔

آخر بنت عتبہ نے اللہ کا نام لے کر کمان سنبھالی۔ ترکش سے تیر نکال کر اس میں جوڑا۔ پھر اس نے رومی سالار توما کو نظروں میں رکھ کے نشانہ باندھا۔ توما کے جسم پر تیر مارنا بیکار تھا۔ سوائے آنکھوں کے اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں تیر کام کر سکے اور متحرک گھوڑے پر سے متحرک سوار کی آنکھ کا نشانہ بنانا ناممکن نظر آتا تھا۔ یوں کئی منٹ تک بنت عتبہ کی کمان توما کے جسم کے ساتھ گھومتی رہی۔ اس نے چلہ پوری طاقت سے کھینچ رکھا تھا صرف تیر چھوڑنے کی دیر تھی۔ توما بہت دیر تک اس کے نشانے پر آ آ کر نکلتا رہا مگر بنت عتبہ نے بھی ہمت نہ ہاری اور آخر ایک بار بسم اللہ کے ساتھ بنت عتبہ کی کمان سے تیر نکلا اور سیدھ سپہ سالار توما کی آنکھ میں پیوست ہو گیا۔ بنت عتبہ کا دل خوشی سے کھل اٹھا اور اس کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔

سپہ سالار توما کی آنکھ میں تیر لگنا تھا کہ رومیوں میں کہرام برپا ہو گیا۔ توما تکلیف سے چیخ اٹھا۔ رومیوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ اس سے مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا اور ایک زبردست حملہ کیا۔ رومی اپنے سالار کو ڈھالوں کی آڑ میں لے کر پسپا ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی مسلمان تیر اندازوں نے ان پر تیروں کی بارش کر دی۔ بنت عتبہ کی کمان سے بھی زنازن تیر نکلنے لگے۔ بنت عتبہ تیر پھینکتی جاتی اور رجزیہ اشعار پڑھتی جاتی تھی۔ اور اس کمان سے نکلنے والے ہر تیرے سے جیسے یہ آواز

بلند ہو رہی تھی :۔

''اے ابان کی بیوہ! اے شہید کی بیٹی تو اپنا انتقام لینے کے لئے دشمنوں پر مسلسل تیر برساتی جا۔ رومیوں نے تیرے تیروں کی ہلاکت سے ڈر کر چیخ و پکار شروع کر دی ہے۔''

وہ رومی جو بڑے جوش و خروش سے ''صلیب واپس لینے کے لئے نکلے تھے وہ اپنے پیچھے کئی سو لاشیں چھوڑ کر قلعہ میں واپس چلے گئے۔ رومی اگر چہ سالار توما کو بچا کر تو لے گئے لیکن بنت عتبہ کا تیر اب تک اس کی آنکھ میں پیوست تھا۔ بنت عتبہ کے انتقام کا یہ تیر توما کی آنکھ سے نہ نکل سکا۔ قلعہ کے تمام طبیبوں اور جراحوں نے کوشش کی مگر نا کام رہے۔ آخر تیر کی لکڑی کاٹ دی گئی اور آہنی نوک توما کی آنکھ میں پیوست ہو کر رہ گئی۔''

-------The End-------ختم شد---------